سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

[redacted]

[redacted]

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۲ | فروری ۱۹۹۶ ' رمضان ۱۴۱۶ | عدد ۲

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ ' ملتان روڈ لاہور ۔ ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۰۱۲۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فون ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے

زر سالانہ -/۱۵۰ روپے

مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش ' مسقط -/۴۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ ' مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ ' کینیڈا ' آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

○

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی، دوسری طرف ترکوں کے علما اور مشائخ تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے، ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی، اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ اور کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنائے جا رہے تھے جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے، مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر نہ صرف ان مفسرین، و محدثین بلکہ خود قرآن و حدیث سے منحرف ہو جاتے ہیں، وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کیے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں، خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنت رسول ؐ میں مقرر کیے گئے ہیں — تمدن و معاشرت میں کامل مغربیت، زبان اور ادب اور سیاست میں انتہا درجہ کی جنسی عصبیت، الغائے خلافت کے بعد مذہب و سلطنت کی تفریق اور پھر خالدہ خانم کے بقول سلطنت کو مذہب سے آزاد کر کے مذہب کو سلطنت کا پابند بنا دینا، اسلامی قانون کے بجائے سوئیٹزرلینڈ کا قانون اختیار کرنا، وراثت اور طلاق وغیرہ مسائل میں قرآن کے صریح احکام تک کو بدل ڈالنا، عورتوں کو اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف اس آزادی کی روش پر ڈال دینا جس پر جنگ عظیم کے بعد یورپ کی عورتیں چل رہی ہیں، یہ سب قدرتی نتائج ہیں، جاہل علما کے جمود، اور ہوا پرست صوفیا کی گمراہی، اور خلافت کے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے سلاطین کی خود غرضی، اور انقلابی لیڈروں کی قرآن و سنت رسول ؐ کے علم سے کلی جہالت کے۔ افسوس کہ اس صدی میں ترکی قوم نے ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو قرآن میں بصیرت رکھنے والا اور اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کو سمجھنے والا ہوتا، اور زمانے کے متغیر حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح اجتہادی قوت سے کام لیتا، اور اصول اسلام کو ان حالات پر منطبق کر کے ایک ایسا سمویا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب و سنت پر ہوتی اور جس میں رفتار زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی، تقریظ و انتقاد، جلد ۷، عدد ۵، ذیقعدہ ۵۴ ۱۳، فروری ۱۹۳۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کامیاب زندگی ، تقویٰ کی زندگی

خرم مراد

ہماری مختصر زندگی کے شب و روز کس چیز کی آرزو اور جستجو میں گزرتے ہیں؟ کامیابی کی! کامیاب زندگی کی! کامیابی کا لفظ ، کامیابی کا تصور ، کامیابی کا خیال ، کامیابی کی منزل: ان سے زیادہ حسین ، دل نواز اور محبوب زندگی میں کوئی شے نہیں۔ ہم زندگی بھر کسی نہ کسی کامیابی کی تلاش میں سرگرداں اور کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارا ہر کام ، ہر بھاگ دوڑ ، ہر مہم کا مقصود و مطلوب کامیابی کا حصول ہوتا ہے۔ ہم ہر چھوٹا بڑا اقدام کامیابی کی دُھن میں اٹھاتے ہیں ، بڑے بڑے حیرت انگیز معرکے بھی اسی دُھن میں سر کر لیتے ہیں۔ پوری زندگی ، کامیاب زندگی ہو ، پھر اس سے بڑی آرزو اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی بھی ہے۔

کامیابی کیا ہے؟ اپنے مقصود کو پالینا ہی کامیابی ہے۔ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصود ہوتا ہے ، تو پھر ساری زندگی کا مقصود کیا ہے؟ کیا یہ کہ ہم کھیل کود اور لہو و لعب سے اپنے دل کو بہلا لیں اور تفریح کے مزے لوٹیں؟ یا یہ کہ ہم جسم کی ، لباس کی ، مکان کی ، زیب و زینت اور آرایش و زیبائش سے اپنے دل و نگاہ کی لذت کا سامان کر لیں؟ یا یہ کہ سامان زینت ، مال و دولت ، تعداد و قوت ، اولاد و برادری ، نام و شہرت ، رتبہ و اقتدار زیادہ سے زیادہ حاصل کر لیں ، دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھ جائیں ، ان پر برتری حاصل کر لیں؟ بے شک ان میں سے ہر چیز کی کشش ہمارے اندر رکھی گئی ہے (زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ) ، ہر چیز میں زندگی کے لیے قدر و قیمت ہے ، ہر چیز میں لذت اور عیش کا سامان ہے ، اور بے شک ان میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے۔ (قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ ، پوچھو کس نے اللہ کی زینت کو حرام کیا ہے ، جو اس نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر کامیابی کی لذت اور عیش بس آخری سانس تک ہے۔ ان میں سے ہر چیز لہلہاتی ہوئی کھیتی کی طرح بالآخر خشک ہو جاتی ہے ، زرد پڑ جاتی ہے ، اپنی زینت اور لذت کھو دیتی ہے اور چورا چورا

ہوکر مٹی میں مل جاتی ہے۔ ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا اس جہان بے وفا کی ہر چیز کا مقدر فنا کے گھاٹ اتر جانا ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔

پھر کیا کوئی نسخہ ایسا بھی ہے جو اس چُورا چُورا ہوکر مٹی میں مل جانے والی کھیتی سے سدا بہار فصل پیدا کر دے، جو ان فنا ہونے والی لذتوں کو ابدی لذتوں میں، یہاں کے عارضی عیش کو ہمیشہ ہمیشہ کے عیش میں تبدیل کر دے، اور مٹ جانے والی متاع کے بدلے میں ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں سے جھولی بھر دے؟

ہاں، قرآن کہتا ہے، ایسا نسخہ موجود ہے، اور وہ بڑا آسان اور یقینی بھی ہے۔ یہ نسخہ تقویٰ کی زندگی کا نسخہ ہے۔ تقویٰ کی زندگی کیا ہے؟ وہ زندگی جس کا مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ ہو، جس کا مرکز و محور وہ ہو، اس کی عبادت اور بندگی ہو، اس کی اطاعت ہو، اس کی محبت ہو۔ جس زندگی میں ہمارا ہر کام ایسا ہو کہ وہ عبادت کا کام ہو، وہ زندگی جس میں ہمارے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہو۔ نہ خواہش نفس کی، نہ دنیا کے عیش و لذت کی، نہ جاہ و مال کی، نہ کسی انسان کی — اور ہر کام اس کے حکم سے ہو۔ یعنی ہر کام اس کی خوشنودی کی خاطر ہو، اس کی مرضی کے مطابق ہو، اس کے حکم کی تعمیل میں ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی معبود اور محبوب ہے، اس لیے کوئی کام ایسا نہ ہو جو اس کو ناراض کرنے والا ہو، ایسا کام کرنا اتنا ہی ناگوار اور ناقابل برداشت ہو جیسے آگ میں جلنا۔

ایسی زندگی ہی کو قرآن میں تقویٰ کی زندگی بتایا گیا ہے۔ اسی کے لیے دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیوں کی خوش خبری ہے۔ یہی زندگی ہر قسم کے نقصان اور ضرر کے خوف اور غم کے تاریک سایوں سے محفوظ ہے۔ یہی زندگی کامیاب زندگی ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ — لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ، لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (یونس ۱۰: ۶۲-۶۴)۔

ترجمہ: جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے ہمارے اوپر شفیق و رحیم ہے، ہمارا خیرخواہ ہے۔ اسی لیے وہ ہم سب کو، اگلوں کو بھی اور پچھلوں کو بھی، ایک ہی وصیت فرماتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ (النساء ۴: ۱۳۱)۔

ترجمہ: تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے رہو۔

اللہ کے سارے انبیا یہی پیغام لے کر آئے، اسی کی تعلیم دی، اسی مقصد کے لیے زندگیوں کا تزکیہ کیا، کہ صرف اللہ کو معبود بناؤ اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرو۔ اس مقصد کے لیے ہمارا کہنا مانو، کہ اللہ پر ایمان اور اس سے محبت کا راستہ یہی ہے۔ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ. فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ (الشعراء ۲۶: ۱۰۷-۱۰۸)۔

غور کیجیے تو قرآن مجید بھی متقی بننے کا کورس ہے، راہ نما اور گائیڈ ہے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یہی نزول قرآن کا مقصد ہے۔ وہ زندگی کو سنوارتا ہے، تقویٰ کی راہ کھولتا ہے، اس پر چلاتا ہے، اس کو پختہ تر کرتا ہے، کیونکہ تقویٰ ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، تقویٰ ہی پر آخرت کی کامیابی کا مدار ہے، روحانی صحت، دل کی طمانیت، آنکھوں کی ٹھنڈک اور محبت خاطر تقویٰ ہی کا نتیجہ ہے۔

دنیوی لحاظ سے کامیاب زندگی کیا ہے؟ جو آسمان و زمین کی نعمتوں سے مالا مال ہو، اس کا حصول تقویٰ پر منحصر ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، (الاعراف ۷: ۹۶) ”اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے“۔

تقویٰ کا لازمی نتیجہ استغفار ہے، اور استغفار کے نتیجے میں آسمان و زمین سے برکتوں کے دہانے کھل جاتے ہیں: یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا، وَّیُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا (نوح ۷۱: ۱۱-۱۲) ”تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کرے گا“۔

کامیاب زندگی وہ ہے جسے دشمن کی چالوں اور تدبیروں سے حفاظت حاصل ہو۔ یہ بھی تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (آل عمران ۳: ۱۲۰)۔

کامیاب زندگی وہ ہے جس میں مشکلات آسان ہوں، دشواریوں میں راستہ نکلے، رزق نصیب ہو، ہر کام آسان ہو۔ اس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے: مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا (الطلاق ۶۵: ۲-۴)۔

دنیا و آخرت میں اللہ کی معیت اور محبت اور اس کے نزدیک قبولیت کی بشارت بھی متقین کے لیے ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ”یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں“۔

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ”اللہ تو متقیوں کی نذریں قبول کرتا ہے“۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ”بے شک اللہ متقیوں کو محبوب رکھتا ہے“۔

اور آخرت میں تو ان ہی کے لیے مغفرت ہے، آگ سے نجات ہے، جنت ہے، جنت کی نعمتیں ہیں، کامیابی کی نوید ہے۔ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ - اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا - اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ، فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ - وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ - بلکہ جنت تو تیار ہی متقین کے لیے کی گئی ہے، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ان کے بالکل قریب لے آئی جائے گی، تقویٰ ہو تو وہ جنت کیا دور ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ۔

تقویٰ کا یہ مقام کیوں ہے؟ یہ جاننے کے لیے تقویٰ کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔ تقویٰ کے معنی بچنے اور ڈرنے کے ہیں۔ بچنا اور ڈرنا کس چیز سے؟ اپنے معبود کی ناراضی سے، جو سب سے بڑھ کر محبوب بھی ہے، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ لیکن بچنا اور ڈرنا، اتنی اعلیٰ انسانی صفات کاملہ کا جامع کیسے ہو گیا؟ اس لیے کہ معبود حقیقی بے انتہا رحم کرنے والا ہے، سراپا شفقت ہے، ایک ایک لمحے اور ایک ایک ضرورت کے لیے دست گیری کرنے والا ہے، اس نے یہ چند روزہ زندگی دے کر اپنے پاس اتنے لامتناہی اجر عظیم کا دروازہ کھول دیا کہ اس کا تصور بھی محال ہے۔ يَوْمِ الدِّيْنِ اس کی انتہائی رحمت کا دن ہو گا۔ ایک حصہ رحمت کی جلوہ گری اس دنیا میں ہے، ننانوے فی صد حصوں کی اس دن ہو گی۔ پھر ایسے رحمان سے ڈر اور خوف، خشیت اور تقویٰ کس لیے: اگر میں اس بے پایاں رحمت کا شکر یہ ادا کروں! اگر اس کی اتنی بے پایاں رحمت کے باوجود میں اس کے انعام اور جنت سے محروم رہوں! کیا ہو گا اگر یہ رحمت مجھ سے چھن جائے! اتنا اجر عظیم، پتہ نہیں یہ مجھے ملتا ہے یا نہیں! اتنی رحمت اور اتنے آسان اجر کے باوجود کہیں میں محروم نہ رہ جاؤں! یہ ہے تقویٰ اور خشیت کی اصل بنیاد۔ تمام اعلیٰ صفات کاملہ اس مکمل عبودیت اور محبت کے سرچشمے سے ابلتی ہیں۔ ہم اللہ سے ایمان، بندگی اور محبت کا یہ تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ پھر ہم ہر فنا ہونے والی، ڈوبنے والی چیز سے منہ موڑ کے، اپنا رخ، اپنی زندگی کی سمت، اپنی بھاگ دوڑ کا ہدف اسی کو بنا لیتے ہیں جس کے بے پناہ جلال اور بے پایاں اکرام کا فیضان ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ پھر ہم زندگی کے سارے واقعات اور حوادث اور راحت و الم اور اسباب و علل کے پردے کے پیچھے اسی رب رحمان کی تدبیر اور تعریف کو کار فرما دیکھتے ہیں۔ پھر ہم اپنی زندگی کا لنگر اسی احد و صمد ذات کی چٹان پر ڈال دیتے ہیں جو کسی کا محتاج نہیں مگر ہماری ہر ہر حاجت وہی پوری کرتا ہے، اور وہی کر سکتا ہے، اور اس کے علاوہ ہر مخلوق کے ساتھ محتاجی کا رشتہ قطع کر دیتے ہیں۔ پھر ہم صرف اسی کے ہو رہتے ہیں اور حنیف بن جاتے ہیں۔ پھر ہم ہر وقت اس پر ہر حکم بجا لانے کے لیے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، اور اس کے ابروئے چشم کے اشارے پر دوڑ دوڑ کر ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے اس کی خوشنودی حاصل ہو، کہ ہمارے دل پر، جو ہمارے ہر فعل کا محرک ہے، وہی وحدہ لاشریک حاکم ہوتا ہے۔ پھر ہم ہر کام کرتے

ہوئے اپنی نظر اس کے وجہ کریم پر رکھتے ہیں کہ وہ ہم سے خوش ہے' ناراض تو نہیں' اور اسی نظر میں دو جہاں کی لذت پاتے ہیں۔ پھر ہم ان مقامات کی طلب میں گریہ و زاری کرتے ہیں' اور ان کا جتنا حصہ بھی نصیب ہو جائے' اسی کے دین سمجھتے ہیں' اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں' اور اس پر اس کی حمد و شکر سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ لَکَ الْحَمدُ حَتّٰی تَرضٰی، وَلَکَ الْحَمدُ اِذَا رَضِیتَ (تیری حمد ہے یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے' اور تیری ہی حمد ہے جب تو راضی ہو جائے) اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ (اللہ کی حمد ہے جس نے ہمیں اس راہ پر چلایا' اور یہ ہمارے بس میں نہ تھا کہ ہم خود چلتے۔ اگر اللہ (ہمارا ہاتھ پکڑ کے) ہمیں نہ چلاتا۔

جس کو جتنا نصیب ہو جائے' وہ متقی ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں انقلاب آ جاتا ہے۔ اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جو کہتا ہے' وہ کرتا ہے' جس طرح وہ رکھتا ہے اس طرح رہتا ہے۔ ایک رضا بالحکم پر کاربند رہتا ہے' دوسری طرف رضا بالقضا کی کیفیت میں جیتا ہے۔ ایک طرف اس ایمان کے نتیجہ میں جس کی حلاوت کو محبت رگ و ریشے میں اتار دیتی ہے (ایماناً یباشر قلبی) رضیت باللّٰہ ربًا وبالاسلام دینًا وبمحمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم نبیًا کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف یقیناً صادقًا حتی اعلم انہ لن یصیبنی الا ما کتبت لی و رضًا بما قسمت لی (سچا یقین کہ مجھ پر ہرگز کچھ نہ پڑے گا سوائے اس کے جو تو نے لکھ دیا ہے' اور جو تو دے اس پر راضی رہوں) کی پکار نکلتی ہے تو وہ اقرار کرتا ہے۔ اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت (جو تو دے اس کو روکنے والا کوئی نہیں' جو تو منع کر دے اسے دینے والا کوئی نہیں)۔

اسی لیے امام غزالی فرماتے ہیں: "جس نے تقویٰ اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہو گئے' اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے۔ جو بات اصل تھی سو وہ حاصل ہو گئی"۔ اب وہ ہر خوف اور ہر حزن سے مامون و محفوظ ہے: فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ' جو تقویٰ اختیار کرے اور اپنی حالت درست کرے' ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ حزن (الاعراف ۷: ۳۵)۔

تقویٰ کو ناپنے کے پیمانے تو بہت ہیں' لیکن سچی بات یہ ہے کہ تقویٰ تو قلب کا فعل ہے۔ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے فرمایا: تقویٰ یہاں ہے' تقویٰ یہاں ہے' تقویٰ یہاں ہے (اور اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا)۔ اس کی کیفیت و کمیت کو جاننے والا صرف اللہ ہے' اس کے علاوہ نہ کوئی جان سکتا ہے' نہ کوئی پیمانہ اسے ناپ سکتا ہے۔ ہم خود اپنے کو کچھ سمجھنے لگیں' متقی سمجھنے لگیں' تو اس خیال سے بڑھ کر تقویٰ کو غارت کرنے والی اور کوئی چیز نہیں۔ فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ، ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی' (النجم ۵۳: ۳۲)۔

تقویٰ کے حقیقی مظاہر کیا ہیں؟ حق کو قبول کرنا' حق پر کاربند ہونا' حق کو پہچاننا (الزمر: ۳۹)۔ ایمان' اور صرف اللہ کی محبت میں اپنا مال خرچ کرنا' ایفائے عہد' اور صبر و استقامت' تنگی اور شدائد

میں بھی، مرض میں بھی، اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے جنگوں میں بھی (البقرہ ۲: ۱۷۷)۔ ایفائے عہد کا تو متعدد جگہ ذکر ہے، کہ اسی پر سارا دین قائم ہے۔ تنگی ہو یا فراخی، دل کھول کر خرچ کرنا، دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے دینا، غصہ کو پی جانا، انسانوں کو معاف کر دینا، اور ظلم و فاحشہ کا بھی ارتکاب ہو جائے (جو ایک متقی سے ہو سکتا ہے) تو فوراً اللہ کو یاد کرنا، اس سے استغفار کرنا، اور اپنے گناہوں پر نہ اڑنا (آل عمران ۳: ۱۳۵)۔ راتوں کو کم سونا اور اپنے معبود و محبوب سے مناجات کرنا، آخر شب میں اپنے گناہوں پر آہ و زاری کرنا اور اس سے بخشش طلب کرنا اور اپنے مال میں ہر مانگنے والے اور ہر محروم کا حصہ لگانا (الذاریات ۵۱: ۱۹)۔

تقویٰ کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ قرآن نے پہلے ہی قدم پر اس کا نسخہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ وہ کہتا ہے، تقویٰ کی عمارت ایمان بالغیب کی مضبوط چٹان پر ہی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ تقویٰ کا مقام قلب ہے، اس لیے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ، الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ یعنی اللہ کی وحدہ لاشریک الوہیت کا اور اس کی صفات کا اقرار، اور ان پر یقین، موت کے بعد آخرت میں اللہ سے ملاقات، حساب کتاب اور جنت و جہنم پر یقین، انبیا و کتب و ملائکہ پر ایمان۔ اس ایمان کے جس پہلو پر نظر ڈالیے، وہ تقویٰ کی بنیاد ہے۔ لیکن ان میں سے ہر حقیقت غیب میں پوشیدہ ہے۔ امور غیبی کا صرف زبانی اقرار تقویٰ کے لیے کافی نہیں، ان پر ایسا ایمان درکار ہے کہ دل پر بیٹھ جائے، دل پر نقش ہو جائے، ایسا یقینی ہو جائے گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اللہ کی بندگی ایسے کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو''۔

اس یقین کا راستہ ہے اللہ کی یاد۔ چنانچہ قرآن جب تقویٰ پر کاربند رہنے کی ہدایت کرتا ہے، تو معاً اللہ کو یاد کرنے کا نسخہ تجویز کرتا ہے، اور اس کی تاکید کرتا ہے۔ اتَّقُوا اللّٰهَ، اللہ سے تقویٰ کی زندگی اختیار کرو۔ اور یاد رکھو اللہ متقین کے ساتھ ہے۔ اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے۔ تم اسی کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔ تم اس سے ملاقات کرنے والے ہو۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اللہ جو عمل تم کرتے ہو، اسے دیکھتا ہے۔ اللہ متقین سے محبت کرتا ہے۔ دنیا کی متاع کچھ بھی نہیں، جو تقویٰ اختیار کرے اس کے لیے آخرت ہے۔ آگ سے ڈرو۔ اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔

دل ہر قسم کے خیالات کا مرکز ہے۔ کسی خیال کو ارادے کی قوت سے، کوشش سے، پیدا ہونے سے روک دینا، انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ نہ ہمیں انھیں پیدا کرنے پر قدرت ہے، نہ فنا کر دینے پر۔ لیکن اتنی طاقت ہم کو دی گئی ہے کہ ہم ایک طرح کے خیالات کی جگہ دوسری طرح کے خیالات دل میں بسا دیں۔ کیونکہ تقویٰ کا مقام دل ہے، اس لیے مجاہدہ کے ذریعہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال اور اس کی یاد کو بسائے بغیر تقویٰ کے حصول کا کوئی راستہ نہیں۔ اگر ہم دل میں اللہ تعالیٰ، اس کی صفات اور آخرت میں اس سے ملاقات کی یاد کو بسائیں گے تو تقویٰ کے منافی اور تقویٰ کے لیے مہلک خیالات

دل کو خالی کر دیں گے۔ نور اور ظلمت کے مقابلے میں نور آئے گا، تو ظلمت خود ہی کافور ہو جائے گی۔

اسی لیے قرآن مجید نے بار بار ذکر کرنے کی ہدایت کی ہے، کثرت سے ذکر کرنے کی ہدایت کی ہے، صبح و شام ہر وقت ذکر کرنے کی ہدایت کی ہے، کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حالت میں ذکر کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اس ذکر کو قائم کرنے کا مجاہدہ نماز ہے۔ جس کی تاکید ایمان بالغیب کے فوراً بعد کی گئی ہے، وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ۔

تقویٰ کے جو مظاہر اوپر بیان ہوئے، یہ صرف مظاہر اور صفات ہی نہیں، یہی وہ وسائل و ذرائع ہیں، نسخے ہیں، تربیتی کورس ہیں، جن سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے، قوی ہوتا ہے، رنگ پکڑتا ہے۔ مجاہدہ کر کے اللہ کو یاد کریں، اس کی محبت کی خاطر اس کی راہ میں مال خرچ کریں، بندوں پر بھی اور فی سبیل اللہ بھی، غصہ پینے کی مشق کریں، انسانوں کو معاف کرنے کا مجاہدہ کریں، اپنا احتساب کریں اور اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہائیں، آہ و زاری کریں، توبہ کریں، خصوصاً رات کے چند لمحات اس کام کے لیے وقف کر دیں۔ ان اعمال سے، اگرچہ بہ مشقت ہوں، بہ تکلف ہوں، تقویٰ یقیناً پیدا ہو گا۔

قرآن مجید متقین کے لیے گائیڈ بک ہے، تربیتی کورس ہے، نصاب ہے۔ تقویٰ ہی سے قرآن سے ہدایت پانے اور قرآن پر عمل کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید رمضان المبارک کے اس مبارک مہینہ میں نازل ہوا۔ اس مبارک مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے روزہ کی عبادت کے لیے مخصوص کیا، اور روزہ کا مقصد یہ بیان کیا کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ امید ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو گا۔

رمضان کے نوری، ملکوتی شب و روز ہمارے اوپر سایہ فگن ہیں۔ آپ غور کریں گے تو نفس کے مطالبات پر قابو پانے، دل کو اللہ کی یاد اور نیک خیالات سے آباد رکھنے، قرآن کو پڑھنے اور سننے، شب میں اللہ کے سامنے گڑگڑانے اور آہ و زاری کرنے، اس کے سامنے اپنی مکمل فقیری اور محتاجی کا اقرار کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور قیمتی وقت اور کوئی آپ کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ اس ماہ میں برکتوں کے جو خزانے لٹائے جا رہے ہیں، ان سے اپنی جھولی بھرنے کی فکر کریں، اسی کی آرزو اور جستجو میں شب و روز گزاریں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے، اور آپ کو تقویٰ کی نعمت سے مالا مال کرے۔

رمضان کا حق ادا کیجئے

آیئے اس کے لیے تیاری کریں !
ان بد نصیبوں میں نہ ہو جائیں جن کے حصے میں '
فاقے اور رت جگے آتے ہیں۔

ان خوش نصیبوں میں ہو جائیں جن کے حصے میں
رحمت 'مغفرت اور نجات آتی ہے۔

کس طرح؟

— خوب انفاق کریں 'کیا معلوم پھر موقع ملے 'نہ ملے۔
رسول کی مثال سامنے رہے 'تیز ہوا کی طرح !

— خوب نمازیں پڑھیں ' دل لگا کر ' آخری نماز جان کر '
دن اور رات کے اوقات مقرر کر کے

— خوب قرآن کی تلاوت کریں۔ یہ مہینہ قرآن ہی کی وجہ سے عظیم ہے ' سمجھیں 'کہ آپ کا رب آپ سے کیا چاہتا ہے

— دعوت الی اللہ میں اپنے آپ کو کھپا دیں 'کہ یہی اسوہ حسنہ اور اسوہ رسول علیہ الصلوۃ والسلام ہے

— خوب دعائیں کریں ' اپنے لیے ' ملت اسلامیہ کے لیے ' پاکستان کے لیے 'تحریک اسلامی کے لیے ' مجاہدین کے لیے۔ یہ دعائیں قبول کروانے کا مہینہ ہے !

یوں ، اپنے رب سے قریب ہو جائیں - اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیں ، جھولیاں بھر لیں ، اس کی جنت پالیں - (اور کیا چاہیے !)

(بندۂ خدا)

اسلام اور جمہوریت

نظریۂ خلافت: اسلامی جمہوریت کی بنیاد

اسلام میں اصلی حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے انھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔

اسلام حاکمیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔

[سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں] کام کی بات یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے وہ عمومی خلافت ہے کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

یہ ہے اسلام میں جمہوریت کی اصل بنیاد۔

عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ ایسی سوسائٹی، جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوں گے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہو گی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہو گی۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے۔

۲۔ ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا کسی گروہ افراد کے لیے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور

اس کی شخصیت کے ارتقا میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہییں۔ اس کے لیے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے ‘ بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور پر بڑھنے میں مانع ہو۔

۳۔ ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ کی ڈکٹیٹرشپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے ‘کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان‘ یا اصطلاحی الفاظ میں ‘تمام خلفا اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے ‘ اور دوسری طرف ان عام خلفا کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق یعنی آمر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے ‘کیونکہ آمریت دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔

۴۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو ‘ خواہ وہ مرد ہو یا عورت رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے ‘ اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے ‘بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے (اسلامی ریاست ‘ ص ۱۳۹ تا ۱۴۳ ‘بحوالہ اسلام کا سیاسی نظریہ)۔

[اس طرح اسلام نے] یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے۔

مغربی تھیوکریسی‘ و جمہوریت اور اسلامی جمہوریت

اسلام میں [مغربی] مذہبی حکومت (Theocracy) کا صرف ایک جز آیا ہے ‘ اور وہ ہے خدا کی حاکمیت کا عقیدہ۔ اس کا دوسرا جز...... یعنی خدا کا ترجمان بن کر خدا کی بادشاہی کو نافذ کرنے کے لیے پادریوں کا طبقہ]..... اسلام میں قطعاً نہیں ہے۔ رہا تیسرا جز ..... [یعنی مذہبی پیشواؤں کے خود ساختہ احکام کو خدائی احکام کی حیثیت سے منوانا] ..... تو اس کے بجائے یہاں قرآن اپنے جامع اور وسیع احکام کے ساتھ موجود ہے ‘ اور اس کی تشریح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی قولی اور عملی ہدایات موجود ہیں جن کی روایات میں سے صحیح کو غلط سے ممیز کرنے کے مستند ذرائع ہمیں حاصل ہیں۔ ان دو ماخذ سے جو کچھ ہمیں ملے صرف وہی من جانب اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی فقیہ ‘ امام ‘ ولی یا عالم کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے قول و فعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چون و چرا مان لیا

جائے۔ اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں تھیوکریسی کہنا قطعاً غلط ہے۔

دوسری جانب مغرب میں جس چیز کو جمہوری حکومت، یعنی ڈیموکریسی کہتے ہیں، وہ بھی دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے۔

(۱) عوام کی قانونی اور سیاسی حاکمیت جو عوام کی اکثریت، یا ان کے منتخب کیے ہوئے نمایندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے، اور

(۲) ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا اور بدل سکنا۔

اسلام اس کے صرف دوسرے جز کو لیتا ہے۔ رہا پہلا جز، تو وہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے قانونی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کرتا ہے جس کے احکام (خواہ وہ کتاب اللہ میں ہوں یا سنت رسول اللہ میں) ریاست کے لیے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاسی حاکمیت کو "حاکمیت" کے بجائے "خلافت" (یعنی اللہ، حاکم حقیقی کی نیابت) قرار دے کر ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ خلافت مسلم عوام کی اکثریت یا ان کے معتمد علیہ نمایندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے گی۔ اس بنیادی فرق کو دیکھتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے (ایضاً، ص ۴۸۰-۴۸۱)۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت

[تمام عامۃ المسلمین کی نیابت] اسلامی خلافت کو قیصریت اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست کے برعکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اہل مغرب جس چیز کو لفظ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے، اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھیرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے ان کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے، اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے، اور ہمارے تصور کے مطابق اسلامی خلافت، اللہ کے قانون کی پابند ہے (اسلامی ریاست، ص ۳۲)۔

مشاورت کا اصول

ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔ جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی

بنیاد اجتماعی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوتی ہے 'ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت کے اصول پر قائم ہوتی ہے... [خلافت کا یہ اقتدار] ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے 'جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے 'ان کے حوالے سے کام کرے 'اس وقت تک حکمراں رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں (اسلامی ریاست 'ص ۷۱۳)۔

اجتماعی خلافت کے مذکورہ بالا تقاضے کو قرآن ان الفاظ میں واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے (الشوریٰ: ۳۸)۔ اس آیت میں اسلامی نظام زندگی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ صرف بیان خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اپنے فحوائے کلام کے لحاظ سے حکم بھی ہے اور اسی بنا پر کسی اجتماعی کام کو مشورے کے بغیر انجام دینا ممنوع ہے۔

یہ حکم نہایت وسیع الفاظ میں ہے اور اس میں شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لیے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو 'یا لوگوں کے نمایندوں سے؟ نمایندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے؟ انتخاب مملکت گیر ہو یا صرف صدر مقام میں؟ انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لیے جائیں جن کی نمایندہ حیثیت معلوم و معروف ہو؟ مجلس شوریٰ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لیے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لیے ہو سکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع ہی قرار دیا ہے۔ البتہ اصولاً اوپر کی آیت اور اس کی توضیح کرنے والی احادیث میں تین باتیں لازم کر دی گئی ہیں۔

(۱) مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ چیز ملوکیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس لیے کہ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم معاملہ تو خود رئیس حکومت کا تقرر ہے۔ اگر دوسرے معاملات میں مشورہ لازم ہے تو رئیس حکومت کا زبردستی مسلط ہو جانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز ڈکٹیٹرشپ کو بھی ممنوع ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی استبداد کے ہیں' اور استبداد شوریٰ کی ضد ہے۔ اسی طرح دستور کو عارضی یا مستقل طور پر معطل کرنے کے اختیارات بھی اس حکم کی موجودگی میں رئیس مملکت کو نہیں دیے جا سکتے 'کیونکہ تعطل کے دور میں لامحالہ وہ

استبداد سے کام کرے گا اور استبداد ممنوع ہے۔

(۲) معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہیے، خواہ وہ براہ راست شریک ہوں یا اپنے معتمد علیہ نمایندوں کے واسطے سے شریک ہوں۔

(۳) مشورہ آزادانہ اور بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہیے۔ دباؤ اور لالچ کے تحت ووٹ یا مشورہ لینا دراصل مشورہ نہ لینے کا ہم معنی ہے۔

پس دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہوں، اس میں شریعت کے یہ تینوں اصول بہرحال محفوظ رہنے چاہییں۔ اس میں ایسی کوئی گنجائش نہ رکھی جانی چاہیے کہ کسی وقت بھی عوام سے یا ان کے معتمد علیہ نمایندوں سے مشورہ لیے بغیر حکومت کی جانے لگے۔ اس میں انتخابات کا ایسا نظام تجویز کیا جانا چاہیے جس سے پوری قوم شریک مشورہ ہو سکے اور اس میں ان اسباب کا سدباب ہونا چاہیے جن کے زیر اثر عوام سے یا ان کے نمایندوں سے خوف یا لالچ یا فریب کے تحت رائے لینا ممکن ہو (ایضاً، ص ۳۷۴ تا ۳۷۵)۔

انقلاب کا راستہ: جمہوریت

ظاہر بات ہے کہ جو لوگ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ آئینی اور جمہوری طریقوں کے پابند ہوں، وہ اپنے نظریے اور پروگرام کو عمل میں لانے کا صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عوام میں اپنے خیالات کی تبلیغ کریں، اور رائے عامہ کو اس بات کا قائل کریں کہ ملک کے مسائل کا جو حل وہ پیش کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ لیکن یہ طریق کار اسی صورت میں بار آور ہو سکتا ہے جب کہ فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہو، اور ان کی رائے ہموار ہو جانے کے معنی یہ ہوں کہ ملک کا نظام اسی نظریے اور پروگرام پر چلے گا جسے انھوں نے پسند اور قبول کیا ہے۔ (تحریک جمہوریت، کراچی بار کونسل سے خطاب، ۱۶ مارچ ۱۹۶۸، ص ۲)۔

پاکستان اور جمہوریت

ہر آدمی کی عقل اس بات کی گواہی دے گی، اور انسانی فطرت انصاف کا جو تصور رکھتی ہے وہ خود اس بات کی شہادت دے گا کہ ایک ملک کے نظام کو چلانے کے لیے اولیں اور پہلی بنیاد اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ ملک کسی شخص کا نہیں، کسی خاندان یا گروہ کا نہیں، بلکہ اپنے سارے باشندوں کا ہے۔ ملک کے متعلق جب اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ سارے باشندوں کا ہے، کسی شخص یا خاندان یا گروہ کا نہیں ہے، تو پھر عقل اور انصاف دونوں اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ملک کا نظام ملک کے باشندوں کی مرضی اور ان کی رائے کے مطابق چلنا چاہیے۔ کسی شخص کا یہ فرض کر لینا کہ ملک کے

کروڑوں باشندے بے عقل اور نااہل ہیں، اور صرف وہی اکیلا ایسا ہے جو عقل اور اہلیت لے کر آیا ہے، یا تو محض بے عقلی ہے یا پھر بدنیتی کے ساتھ ہی ایسی لغو بات زبان سے نکالی جا سکتی ہے۔ کوئی نیک نیت مرد عاقل اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ معقولیت اور انصاف یہ ہے کہ اس بات کو سیدھی طرح سے مان لیا جائے کہ ملک جن باشندوں کا ہے ان ہی کی رائے اور مرضی کے مطابق اس کا نظام چلنا چاہیے۔

عقل اور انصاف دونوں کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے تمام حصہ داروں کو اس کے معاملات میں بولنے کا آزادانہ حق ہونا چاہیے۔ اگر ان کو بولنے کا آزادانہ حق نہیں ہے تو ان کا یہ حق تسلیم کرنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ وہ معاملات چلانے کی ذمہ داری میں شریک ہیں۔

اس کے ساتھ عقل یہ بھی کہتی ہے اور یہی انصاف کا تقاضا بھی ہے کہ ملک کے باشندوں کی اکثریت جس طرح کا نظام چاہے، ویسا ہی نظام ملک میں چلنا چاہیے۔ قلیل التعداد لوگ جو اکثریت کے نظریات سے متفق نہ ہوں، انھیں صبر کے ساتھ اس بات کو برداشت کرنا چاہیے کہ اکثریت کے نظریے پر ملک کا نظام چلے، اور ملک کے اندر ایسے حالات موجود رہنے چاہییں کہ ہر نقطہ نظر رکھنے والا آدمی عوام کے سامنے اپنے نظریات پیش کر سکے اور یہ امید رکھ سکے کہ جس وقت بھی اکثریت اس کی ہم خیال ہو جائے گی ملک کا نظام اس کے نظریات کے مطابق تبدیل ہو جائے گا۔ زبردستی کسی کو اپنے نظریات لوگوں پر ٹھونسنے کا حق نہ ہو۔ سازشیں اور ریشہ دوانیاں کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے دروازے کسی کے لیے کھلے نہ ہوں۔ مگر اظہار خیال کی آزادی ہر ایک کو ہونی چاہیے۔ عوام کی رائے اپنے نظریے کے حق میں ہموار کرنے کے مواقع سب کے لیے کھلے رہنے چاہییں اور ملک کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ عوام کی اکثریت جس نظریے یا جس پروگرام سے متفق ہو جائے، کسی رکاوٹ کے بغیر بالکل پرامن طریقے سے اقتدار اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ کسی اقلیت کو خواہ وہ کیسی ہی باثر ہو، یہ حق نہ ہونا چاہیے کہ وہ اڑ کر بیٹھ جائے اور کہے کہ ہم اس نظریے کو نہ چلنے دیں گے (بحوالہ جمہوریت، جلسہ عام، راولپنڈی، ۱۱ مئی ۱۹۶۸، ص ۴۵ تا ۵۱)۔

میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جب تک اس ملک میں جمہوری نظام بالکل صحیح فطری اور معقول اصولوں پر قائم نہیں ہوتا، اس وقت تک اس ملک کی خیر نہیں ہے۔ اگر ہم یہ غلطی نہیں کرنا چاہتے کہ ڈیڑھ دو سو برس کی غلامی کے بعد جو آزاد مملکت خدا نے ہمیں بخشی ہے اسے اپنے ہاتھوں برباد کر کے پھر کسی عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیں، تو ہمیں سیدھی طرح یہ اصول مان لینے چاہییں کہ:

(۱) ملک باشندوں کا ہے، کسی شخص یا گروہ یا برادری کا نہیں ہے، اس لیے اس کا نظام باشندوں کی مرضی سے ہی بننا اور چلنا چاہیے۔

○ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جن کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنا نمائندہ منتخب کریں۔

○ انتخاب وہی صحیح ہے جس میں ملک کے ہر بالغ شخص کو براہ راست رائے دہی کا حق ہو۔ بالواسطہ انتخاب جمہوریت نہیں بلکہ آمریت چلانے کا آلہ ہوتا ہے۔

○ جس انتخاب میں دھن' دھونس' دھاندلی اور انتظامی افسروں کی مداخلت سے کام لیا جائے وہ سرے سے کوئی انتخاب ہی نہیں ہے اور قوم کو ایسے انتخاب میں رائے دہی کا حق حاصل ہونا یا نہ ہونا بالکل یکساں ہے۔

○ ملازمین حکومت خواہ' وہ فوجی ہوں یا سول' ان کا کام خود حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ عوام کے نمائندوں کے تحت حکومت کا انتظام کرنا ہے۔

○ ملک کے نمائندوں کی جو پارلیمنٹ یا اسمبلی بھی ہو' تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں ہونے چاہییں' کوئی شخص بھی اس پر جج بنا کر نہ بٹھایا جانا چاہیے۔

○ ملک کے نظام کا صحیح طریقے سے چلنا اس پر منحصر ہے کہ ملک میں پریس آزاد ہو' پلیٹ فارم آزاد ہو' خبر رسانی اور نشر و اشاعت کے ذرائع پر کسی طرح کا بے جا کنٹرول نہ ہو' لوگ اپنے ملک کے حالات سے ٹھیک ٹھیک باخبر رکھے جائیں' اور انہیں ہر نقطہ نظر سننے اور آزادی کے ساتھ بحث مباحثہ کر کے رائے قائم کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔

○ ملک کا نظام اس نظریے پر قائم ہونا چاہیے جسے ملک کے باشندوں کی اکثریت قبول کرتی ہو' مگر جن نظریات کے لوگوں کی اقلیت ہو انھیں اس امر کے پورے مواقع حاصل رہنے چاہییں کہ وہ رائے عام کی تائید حاصل کر کے برسر اقتدار آ سکیں' اور کبھی ایسے حالات پیدا نہ ہونے چاہییں کہ کسی خیال کے لوگ تبدیلی نظام کے لیے غیر آئینی راستے تلاش کرنے لگیں۔

[پہلی بنیاد جس] پر زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ پاکستان کا نظام زندگی تعمیر کرنا ممکن ہے' وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کو منبع ہدایت اور اولین ماخذ قانون تسلیم کیا جائے۔ دوسری بنیاد جس پر اتفاق ہو سکتا ہے "جمہوریت" ہے۔ یہ خود قرآن و سنت کا منشا بھی ہے' اور باشندگان ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ ملک کسی خاص شخص' یا طبقے اور گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں' لہٰذا اس کا انتظام ان سب کی' یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے' اور ان کو اصولاً یہ حق اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے حکمراں اپنی آزاد مرضی سے چنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے ان کو تبدیل کر سکیں۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی بہت سی شکلیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور بہت سی نئی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بحث اس کی کسی

خاص شکل میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی اختیار کی جاتی ہے اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگان ملک کی نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں "جمہوریت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے، اس پر عام لوگوں کا مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہرحال ممکن نہیں ہے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے سب یا اکثر باشندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جبکہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں، اور ایسے عناصر کا زور ہو جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں۔ لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر تجربات کی درس گاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے بھلے برے کی وہ خود ذمہ دار ہے، اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی، لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے، اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی مضرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹرشپ یا اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض "تماشائی" بن کر رہتے ہیں اور جب ان حالات کے ردوبدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی رائے اور

مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں، انھیں اس نقصان عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے۔

پچھلے چند سال میں ہمارے ہاں جو حالات پیش آئے ہیں انھیں اس بات کی دلیل ٹھیرایا جاتا ہے کہ یہاں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے، اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ اس کی مختلف قسم کی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ یہاں جمہوریت تو ضرور ہونی چاہیے مگر اسے قابو میں رکھنے والی ایک بالاتر طاقت بھی ضروری ہے جو اس کو بگڑتے دیکھ کر درست کر دیا کرے۔ اور کوئی یہ پردہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا، اور صاف کہتا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی جمہوریت سے ایک خیراندیش اور مستعد آمریت بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے ان تمام حالات پر غور کیا جائے جو اب تک یہاں پیش آئے ہیں تو کسی صاحب بصیرت کے لیے یہ بات سمجھنی مشکل نہ ہوگی کہ یہاں جو چیز ناکام ثابت ہوئی ہے وہ جمہوریت تھی ہی نہیں۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی و ملکی معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ سیکھ کر اپنی غلطیوں کی خود تلافی کرتے چلے جائیں۔ یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہو اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آجائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ یہاں تو جو چیز قائم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمریت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اب اگر اس کے برے نتائج سامنے آگئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے، اور اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اسے کسی نقاب پوش یا بے نقاب آمریت کے حق میں دلیل ٹھیرایا جائے۔

یہ تو ہے استدلال کی غلطی۔ اب رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں، تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پرامن طریقے ہی سے قائم ہو، بہرحال پرامن طریقے سے دفع نہیں ہو سکتی۔ اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں، بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو --- جمہوریت کی نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی --- اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ آمریت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو بہرحال اس کے

فطری نتائج ہیں؟ آمریت خواہ کتنی ہی خیراندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے 'اس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں ' اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردوبدل کسی کھلے کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے جنھیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر متصرف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت ' دلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لیے حرکت میں آسکے۔ اس کا آغاز چاہے کتنی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو ' انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔ مگر خلاصی کے جتنے پرامن راستے ہوتے ہیں وہ انھیں چن چن کر بند کر دیتی ہے اور مجبوراً ملک ایسے انقلاب کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزل خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔

ان نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی کسی نوع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دے گا خواہ آمریت کا وہ مقام خود اسی کو کیوں نہ حاصل رہا ہو (ترجمان القرآن' جلد ۴۴' عدد ۶)۔

اسلام اور جمہوریت

جمہوریت کے [موجودہ نظام کے] بارے میں جو تنقید کی [جا رہی] ہے اس کے تمام نکات اپنی جگہ درست ہیں 'لیکن اس مسئلے میں آخری رائے قائم کرنے سے پہلے چند اور نکات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اولین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لیے اصولاً کون سا طریقہ صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کیے جائیں ' اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو رہے اسی وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کوئی شخص خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلائے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز میں بھی ان لوگوں کی مرضی و رائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو؟

اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے ' تو ہمارے لیے دوسری صورت کی

طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے' اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں' ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے' اگر انھیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں' تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اول یہ کہ "جمہور" کو مختارِ مطلق اور حاکمِ مطلق فرض کر لیا گیا اور اس بنا پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جمہور اور ان کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لیے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہوگی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور جتنی زیادہ ہوگی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار اور مضبوط رائے عام پر ہے۔ اس طرح کی رائے عام اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو' ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو' اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے لوگ اس میں نہ پھل پھول سکیں' اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لیے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے' وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ (مرتبہ: خ - م)

23

شاہ ولی اللہ کے اصولِ تفسیر

(دوسری اور آخری قسط)

۲۔ علم تذکیر بآلاء اللّٰہ

۱۔ کیونکہ قرآن مجید تمام انسانوں کی تہذیب و تزکیہ کے لیے نازل ہوا ہے' وہ عربی ہوں یا عجمی' شہری ہوں یا دیہاتی۔ [ساتویں صدی میں ہوں یا اکیسویں میں] اس لیے حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ تذکیر کے لیے آفاق و انفس کی نشانیوں سے جس قدر قرآن مجید کے مخاطب واقف تھے نہ اس سے زیادہ کوئی بات بیان کی جائے' نہ ان کے بارے میں غیر ضروری بحث و تحقیق میں پڑا جائے۔ [چنانچہ آج انسان کو کائنات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے' قرآن میں اس کی تلاش غیر ضروری ہے]۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسما کے بارے میں بھی قرآن مجید میں ایسے صاف' سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں بات کی گئی ہے کہ ایک عام مخاطب صرف اس ذہانت اور سمجھ بوجھ کے ذریعے انھیں سمجھ لے جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے' اور صفات الٰہیہ کو سمجھنے کے لیے اس کو نہ فلسفہ و منطق کی ضرورت پڑے' نہ حکمت الٰہی سے گہری واقفیت کی۔

چنانچہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا صرف اجمالاً اثبات کیا ہے' مگر اس کے ثبوت میں دلائل نہیں دیے ہیں۔ کیونکہ اللہ کا اقرار تمام بنی آدم میں عام ہے' اور کسی معتدل ملک میں ایسی قوم نہیں ملے گی جو اس کے وجود کی منکر ہو۔ صفات کا معاملہ ذرا مشکل ہے۔ ایک طرف انسان کے لیے ان کی پوری حقیقت سمجھنا ممکن نہیں [کہ صرف وہی خالق ہے' باقی سب مخلوق]۔ دوسری طرف اگر اسے اللہ کی صفات سے بالکل آگاہی نہ ہو' تو وہ اللہ کی معرفت اور اس سے تعلق سے محروم رہے گا' جو اس کے تزکیہ نفس کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ اس نے چند ایسی انسانی صفات منتخب کیں' جنھیں لوگ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں' اور جنھیں وہ قابل تعریف اور اعلیٰ صفات تصور کرتے ہیں۔ ان انسانی صفات کو صفاتِ الٰہی کے ان دقیق معانی کی جگہ استعمال کیا' جن کی عظمت اور جلال تک انسانی عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ ساتھ ہی جہالت اور غلط فہمی کی روک تھام اور علاج کے لیے لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ کا حکم بھی لگا دیا۔

چنانچہ وہ رحم کرتا ہے ' سنتا ہے ' دیکھتا ہے ' ناراض ہوتا ہے 'مگر اس کی رحمت ' سننا ' دیکھنا اور ناراض ہونا کسی طرح انسانوں کی رحمت ' سننے 'لکھنے اور ناراضی کی طرح نہیں ۔کیونکہ صفات کے باب میں صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کا مسئلہ بڑا باریک اور نازک ہے 'جس تک عام ذہن کا پہنچنا ممکن نہیں 'اس لیے اس مسئلے میں گفتگو کرنے سے بھی روک دیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آفاق و انفس کی صرف وہی نعمتیں بیان کیں جن سے عام لوگ واقف ہوتے ہیں 'اور ہر زمانے میں سمجھ سکتے ہیں 'ان نعمتوں کا ذکر نہیں کیا جو چند لوگوں تک محدود اور خاص ہوتی ہیں۔چنانچہ آسمان و زمین کی پیدائش 'پانی کے برسنے ' درختوں کے اگنے 'رات دن کے آنے جانے ' ضروری صنعتوں کے الہام کرنے 'ان پر انسان کو قدرت دینے کا بیان کیا۔اسی طرح مصائب کے ہجوم اور ان کے دور ہو جانے کے وقت لوگوں کے رویے بدل جانے پر اکثر جگہ تنبیہہ فرمائی کہ یہ مرض بکثرت واقع ہوتا ہے۔

۳۔ علم بتذکیر ایام اللہ

۱۔تاریخی واقعات کے سلسلے میں بھی 'قرآن مجید میں وہی واقعات بیان کیے گئے ہیں جن سے اس کے مخاطب آشنا تھے 'مثلاً قوم نوح 'عاد اور ثمود کے قصے 'جنھیں اہل عرب اپنے باپ دادا سے سنتے آئے تھے 'یا حضرت ابراہیم ؑ اور بنی اسرائیل کے واقعات 'جن سے اہل عرب یہودیوں کے ساتھ صدیوں کے تعلق کی بدولت واقف تھے۔ قرآن نے نہ غیر مشہور اور غیر مانوس قصوں کو بیان کیا' نہ ایران و ہندوستان کے واقعات کو' [ورنہ غیر ضروری تفتیش اور بحث کا دروازہ کھل جاتا]۔

۲۔جس طرح قرآن مجید مین کوئی انوکھا یا غیر معروف واقعہ نہیں بیان کیا گیا' اسی طرح مشہور تاریخی واقعات میں سے بھی صرف ان حصوں کو بیان کیا گیا ہے جن کا بیان تذکیر کے لیے ضروری تھا' ان کی تمام تفصیلات کو بیان نہیں کیا گیا۔کیونکہ جب عام لوگ کوئی نیا قصہ سنتے 'یا کسی قصے کی تمام تفصیلات 'تو وہ قصے میں کھو جاتے اور قصہ بیان کرنے کا اصل مقصد کھو جاتا۔

۳۔بعض قصے قرآن نے بار بار بیان کیے ہیں۔سورتوں کے اسلوب کے مطابق 'مختلف انداز میں 'کبھی اجمالاً اور کبھی تفصیلاً۔بعض قصص صرف دو ایک بار بیان کیے ہیں' ان کی تکرار ضروری نہ تھی۔

۴۔تاریخ بیان کرنے کا مقصد کہیں بھی صرف قصہ گوئی یا تاریخی معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ شرک اور گناہوں کی برائی اور خدا کے عذاب کی طرف مبذول ہو 'اور وہ مطیع بندوں پر خدا کے فضل و رحمت اور اس کی نصرت کے ظہور پر مطمئن ہو جائیں۔

۵۔بعض آیات میں اللہ نے اہل ایمان کی جان و مال کی قربانیوں کی تعریف کی ہے 'اور منافقین

کی خوبیاں اور بخل کی مذمت۔ بعض میں اس نے مسلمانوں پر اپنے احسانات کا ذکر کیا ہے، جب اس نے انھیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ بعض میں مسلمانوں کو زجر و تنبیہ کی گئی ہے۔ کہیں غزوات نبوی ؐ یا حضرت زینب ؓ کے نکاح اور افک جیسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب واقعات بھی تذکیر بایام اللہ میں شامل ہیں، اور قرآن فہمی کے لیے ان واقعات سے واقف ہونا ضروری ہے۔

۴۔ علم تذکیر بموت و مابعد

۱۔ موت کے بعد جو کچھ پیش آنے والا ہے، اس کے واقعات کو مختلف سورتوں میں، ان سورتوں کے اسلوب کے مطابق کہیں منتشر اور کہیں مسلسل کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ اس سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ موت کے وقت انسان کی بے چارگی کا کیا عالم ہو گا، صور کس طرح پھونکا جائے گا، حشر و نشر کا منظر کیا ہو گا، سوال جواب کس طرح ہو گا، میزان کس طرح قائم کی جائے گی، نامہ اعمال کس طرح دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، مومنین کس طرح جنت میں جائیں گے، اور کافر کس طرح جہنم میں بھیجے جائیں گے، جہنم میں عوام الناس اور ان کے لیڈروں کے درمیان کس طرح جھگڑا ہو گا۔

۵۔ علم الاحکام

۱۔ علم احکام کے باب میں پہلا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی پر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے ضروری ہوا کہ آپ ؐ کی شریعت میں شریعت ابراہیمی کے احکام کو باقی رکھا جائے، اس کے بنیادی احکام میں کوئی تبدیلی نہ ہو، الا یہ کہ کسی عام حکم کو خاص کر دیا جائے، یا اوقات اور حدود میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔

۲۔ دوسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ آنحضرت ؐ کے ذریعے اہل عرب کی اصلاح کی جائے اور اہل عرب کے ذریعے ساری دنیا کی اس لیے لازم ہوا کہ آپ ؐ کی شریعت کی بنیاد اہل عرب کی رسوم و عادات پر کی جائے۔

۳۔ اگر کوئی شخص شریعت ابراہیمی کے احکام اور اہل عرب کی رسوم و عادات کو دیکھے، پھر آنحضرت ؐ کی شریعت پر نظر ڈالے، جس نے ان احکام و رسوم کی اصلاح و تکمیل کی، تو وہ ہر حکم کے لیے کوئی بنیاد پائے گا اور ہر امر و نہی کے لیے کسی حکمت تک پہنچ جائے گا۔

یہ بات تفصیل طلب ہے۔ مختصراً یوں سمجھا جائے کہ احکام پر عمل میں لاپروائی اور صحیح علم و معرفت کے فقدان کی وجہ سے شریعت ابراہیمی کے احکام میں ایک فتور عظیم برپا ہو گیا تھا، بہت سی تحریفات پیدا ہو گئی تھیں، معاشرت میں ضرر رساں رسوم راہ پا گئی تھیں، اور سیاست بھی بگڑ گئی تھی۔ قرآن مجید نے

تمام بدنظمی اور بے اعتدالی کو ختم کر کے 'احکام میں ہمواری اور اعتدال پیدا کیا' اصول احکام کو نئے سرے سے منضبط کیا' اور ان کی پوری حد بندی کی۔

۴۔ بعض احکام' قرآن مجید میں اجمالی طور پر بیان کیے گئے ہیں' بعد میں آنحضرتؐ نے ان کی تفصیلات مقرر کیں: مثلاً قرآن میں اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے' اس کی روشنی میں' مساجد کی تعمیر' جماعت اور اوقات صلوٰۃ وغیرہ کا تعین فرمایا۔ یہی معاملہ زکوٰۃ کا ہے۔

۵۔ ان احکام کا فائدہ اور اطلاق تمام امت کے لیے عام ہے' ایک دوسری قسم ان احکام کی ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے سوالات کیے' اور آپؐ نے ان کے جوابات دیے۔

۲۔ مشکلات القرآن

کیونکہ قرآن مجید ٹھیک اہل عرب کے محاورے اور اسلوب کے مطابق نازل ہوا' اس لیے اس کے مخاطب عرب' جو اپنی زبان کے سمجھنے کا سلیقہ رکھتے تھے' اس کے مطالب آسانی کے ساتھ سمجھ لیتے تھے۔ کیوں کہ شارع کا منشا یہ تھا کہ آیات متشابہات کی تاویل کی کھوج کرید میں نہ پڑا جائے' نہ صفات الٰہی کی حقیقت کی صورت آفرینی اور قصص قرآنی کی تفصیلات کے درپے ہوا جائے' اس لیے صحابہ کرام آنحضرتؐ سے بہت کم سوال کرتے تھے اور اس باب میں روایات بہت تھوڑی ہیں۔ لیکن جب دور اول کی زبان متروک ہوگئی اور علوم تفسیر میں غیر عرب بھی حصہ لینے لگے' تو بعض مواقع پر شارع کی مراد سمجھنے میں مشکل ہوئی۔ چنانچہ لغت اور نحو میں تحقیق کی ضرورت پڑگئی' اور تفسیر کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ مشکل مقامات اور ان کی مثالیں بیان کر دوں' تاکہ غور و خوض کے وقت طول کلام کی ضرورت نہ پڑے۔

قرآن مجید کی کسی آیت یا مقام کا مفہوم سمجھنے میں دشواری متعدد وجوہ سے پیش آسکتی ہے: (۱) کہیں کوئی غریب اور نادر لفظ استعمال ہوتا ہے' اور اس کے معنی واضح نہ ہونے کی وجہ سے مطلب کہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ (۲) کہیں ناسخ اور منسوخ کو نہ جاننے کی وجہ سے' (۳) کہیں اسباب نزول پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے (۴) کہیں کوئی لفظ حذف ہونے کی وجہ سے مثلاً مضاف یا موصوف' فعل یا مفعول کے حذف کر دینے سے' (۵) کہیں لفظ یا اسلوب میں تبدیلی کی وجہ سے' مثلاً ایک حرف کو دوسرے حرف سے' یا اسم کو اسم سے' یا فعل کو فعل سے' یا جمع کو مفرد سے' یا غایت کے اسلوب کو خطاب سے بدلا گیا ہے' (۶) کبھی مقدم کو موخر یا موخر کو مقدم کرنے کی وجہ سے' (۷) کہیں ضمیر کے غیر معین ہونے اور اپنی جگہ سے ہٹنے کی وجہ سے' (۸) کبھی ایک لفظ کے مختلف معنوں میں استعمال کی وجہ سے' (۹) کبھی تکرار اور تفصیل' کبھی اختصار اور ایجاز' کبھی کنایہ' تعریض یا متشابہ وغیرہ کی وجہ سے۔ جو دوست تدبر قرآن میں تدبر کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں' ان کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام

باتوں کی حقیقت سمجھ لیں، اور ان کی مثالوں سے آگاہ ہوں۔

غریب قرآن

غریب مقامات کے معانی معلوم کرنے کے لیے صحابہ، تابعین اور سلف کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ان مقامات کی بہترین شرح وہ ہے جسے ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ؓ بن عباس سے ابن طلحہ نے نقل کیا ہے، اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں غالباً اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ شرحیں ہیں جنھیں ضحاک نے اور نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ سیوطی نے اپنی مشہور کتاب الاتقان میں ان تینوں شرحوں کا ذکر کیا ہے۔

اس مقام پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صحابہ و تابعین کبھی تفسیر لفظ کے قریب ترین معنی سے کرتے ہیں، جبکہ متاخرین نے ان کی تفسیروں کو لغت اور الفاظ کے مختلف استعمالات کی تحقیق سے بہت وسعت دے دی ہے (تلخیص وتدوین: خ ـ م)۔

28

عشرۂ اعتکاف اور شب قدر

مولانا اشرف علی تھانوی

اللہ تعالیٰ نے شریعت مقدسہ میں ایک خاص خلوت مقدر فرمائی ہے اور ایک بڑے زمانہ میں چھوٹا سا زمانہ اس خلوت کے لیے مشروع فرمایا ہے یعنی رمضان المبارک کا آخری عشرہ۔ اور اس خلوت کا نام اعتکاف رکھا ہے 'خلوت' نہیں رکھا' اس لیے کہ یہ فلاسفہ اور حکما کا دیا ہوا نام ہے۔

اعتکاف کی روح کیا ہے؟ اعتکاف کی روح مجاہدہ کا ایک جزو ہے۔ مجاہدہ کی حقیقت تھی: قلۃ الطعام (کم کھانا) قلۃ المنام (کم سونا) قلۃ الکلام (کم بولنا) قلۃ الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم میل جول رکھنا)۔ مجاہدہ کا ایک جزو یعنی لوگوں سے کم ملنا تھا' نہ ملنا نہیں بلکہ کم ملنا۔ یہ غلطی کی ہوگیہ نے اور حکمائے اشراقیین نے کہ وہ ترکِ اختلاط (ملنے کے چھوڑنے) ہی کو مجاہدہ سمجھے اور اس کی مضرت انھیں یہ ہوئی کہ تعلیم و تعلّم سے محروم ہوگئے۔

اس امت کی خلوت در انجمن (محفل میں تنہائی) ہے ؎

گر با ہمہ چو بامنی بے ہمہ   گر بے ہمہ چو بے منی باہمہ

(اگر تم مخلوق میں مشغول ہو مگر دل ہماری طرف متوجہ ہے تو تم خلوت نشین ہی ہو۔ اور اگر خلوت نشین ہو کر تمھارا دل مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو خلوت نشین نہیں ہو)

اسی کو زیادہ تفصیل سے عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل   بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی

(جب تمھارا دل ہر گھڑی ایک جگہ جاتا ہے تو تم تنہائی میں صفائی نہیں حاصل کر سکتے)

ورت مال و جاہ ست وزرع و تجارت   چو دل باخدا ایست خلوت نشینی

(اور اگر تمھارے پاس مال و دولت ہے اور تجارت و زراعت کرتے ہو' جب دل خدا سے لگاؤ رکھتا ہے تو خلوت نشین ہی ہو)۔

یعنی اگر تم سب کے پاس بیٹھے ہو مگر قلب میری طرف متوجہ ہے تو میرے ساتھ ہو۔ یہ ہے اس امت کی خلوت کہ جلوت میں خلوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو مساجد میں مشروع فرمایا ہے۔ مخاطبین میں بعض ایسے تھے کہ یہ سن کر دس روز تک مسجد میں رہیں گے، نفس کو مزہ آیا کہ آہا خوب باتیں گھڑیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اس طرح انسداد فرمایا کہ مسجد میں ایک چٹائی کا حجرہ بنایا اور اس میں رہے۔ فرمایا کہ مسجد میں اس طرح رہنا چاہیے اور یہی ماخذ ہے اس عادت کا کہ پردہ وغیرہ اعتکاف میں باندھ لیتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شاید کوئی غلو کرتا۔ اس لیے کہ یہ ایک امتیازی شان ہے کہ حجرہ مین خود بیٹھے رہیں اور باہر مریدین و معتقدین جمع ہیں کہ شاہ صاحب نکلیں گے تو زیارت کریں گے اور باتیں کریں گے۔ اس لیے حضور ؐ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ نماز کے وقت، کہ وہی وقت اجتماع کا ہے، خود بخود باہر رونق افروز ہوگئے۔ اسی بنا پر اہل اعتکاف کا طریقہ ہے کہ نماز کے وقت پردہ وغیرہ سب اٹھا دیتے ہیں تاکہ کوئی امتیازی شان پیدا ہو کر عجب نہ ہو۔ واللہ اگر تمام جہان کے عقلا چاہتے کہ ان مصالح کی رعایت کریں تو ہرگز نہ کر سکتے۔ یہ نور وحی ہے کہ جو ایسے دقیق دقیق مصالح کی رعایت فرمائی۔

علاوہ اس کے ایک اور دقیق رعایت یہ کہ اس پر نظر فرمائی کہ رات کو کام زیادہ کرنا چاہیے لیکن رات آرام کا وقت ہے۔ اگر دس کی دس راتیں کام کریں تو بیمار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے ان راتوں کی حق تعالیٰ نے عجیب طریقہ سے تقسیم فرمائی کہ طاق راتوں کو شب قدر بنا کر بتلا دیا کہ ایک رات سوؤ اور ایک رات جاگو اور ان راتوں میں ایسی برکات رکھ دیں کہ ہزار مہینوں کی خلوت سے وہ بات نصیب نہیں جو ان راتوں سے ہوتی ہے۔ اگر حکما اپنی عقل سے ہزار تدبیریں کرتے اور تدبیریں کرتے کرتے مر رہتے تو یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ اس لیے کہ اس کا ادراک کیسے ہوتا، کہ کون سے زمانہ میں کتنی برکت رکھی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح کسی زمانہ کے اندر کوئی برکت پیدا کرنے کی بھی قدرت نہ تھی۔ یہ تو خالق الزمان کے تصرف سے برکت پیدا ہوگئی اور انھی کے بتلانے سے معلوم ہوا۔ صاحبو! یہ برکات تم کو مفت ملتی ہیں۔ دس دن نہ سہی، کم از کم تین ہی دن دنیا کے بکھیڑے چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جاؤ۔ تین دن نہ سہی ایک ہی دن سہی۔ علما نے لکھا ہے کہ ایک گھنٹہ کا اعتکاف بھی مشروع ہے۔ اللہ، اللہ اگر اب بھی کوئی محروم رہے تو بہت ہی خسران کی بات ہے۔ ان کی طرف سے تو کچھ کمی نہیں ہے۔ لیکن آپ بھی تو کچھ حرکت کیجیے۔ ہماری اور حق تعالیٰ کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اور آپ، کہ بچہ چل نہیں سکتا۔ لیکن تم منتظر اس کے ہو کہ یہ کچھ حرکت کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرے تو میں اس کو گود میں اٹھالوں گا، سنبھال لوں گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ بندہ کچھ تو کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرتا ہے تو ادھر سے رحمت ہوتی ہے، جذب ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ادھر سے جذب نہ ہوتا تو یہ

مسافت آپ کے قطع کرنے سے قطع نہ ہوتی۔

جو چیزیں فرض و واجب ہیں ان کے آداب قرآن میں مذکور نہیں بلکہ وہاں صرف صیغہ وجوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (روزوں کو رات تک پورا کرو) اور یہاں خود وَلَا تُبَاشِرُوْ هُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ (اپنی بیویوں سے مباشرت مت کرو جس وقت کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔ فرمایا اس میں اعتکاف کے آداب تو بتلائے مگر اس کے فرض و واجب ہونے سے سکوت فرمایا۔ ایک قسم کا اعتدال ہے کہ نہ فرض و واجب' نہ مباح بلکہ سنت ہے۔ اگر اسے فرض کر دیتے تو اعتدال نہ رہتا۔ اس میں یہ خاص اعتدال رکھا ہے کہ کوئی کرے اور کوئی نہ کرے۔ اور چونکہ حضورؐ نے خود ہمیشہ کیا ہے اور نہ کرنے والوں پر ملامت بھی نہیں فرمائی۔ اس لیے محققین کا مذہب اس کے متعلق سنت موکدہ علی الکفایہ ہونے کا ہے کہ ایک کرلے سب پر بوجھ اتر گیا۔ ایک کرلے اس کی برکت اوروں کو بھی پہنچ جائے' وہ بھی محروم نہ رہیں۔ یہ معنی ہیں سنت علی الکفایہ ہونے کے۔ غرض اعتکاف میں ہر طرح کا اعتدال ہے۔ اور بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

فی المساجد کی تخصیص سے ایک اور حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ مساجد کو اعتکاف کے واسطے اس واسطے مقرر کیا کہ فضیلت جماعت بھی منجملہ فضیلتوں کے ہے تاکہ دونوں فضیلتیں جمع ہو جائیں' اعتکاف کی بھی اور جماعت کی بھی۔ اگر کوئی کوہ یا صحرا یا مکان کی کوئی کوٹھڑی اس کے واسطے تجویز کرتے تو یہ جماعت کی فضیلت سے محروم رہ جاتا۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ تم خود اس جماعت کی برکت کے محتاج ہو۔ اگر نمازی نہ ہوتے تو تم کو یہ برکت کہاں سے حاصل ہوتی۔ تم جماعت کی برکت سے محروم رہتے۔ پس طاعت کے ساتھ ساتھ عُجب کا بھی علاج ہو گیا۔ سبحان اللہ کیا اعتدال ہے۔ حکما کی تجویز کردہ خلوت میں یہ باتیں کہاں۔ اور جب اپنے کو برکات میں ان کا محتاج سمجھے گا تو اس کو کبر نہ ہو گا۔ خلوت اختیار کرتے ہیں کہ لوگوں کے ضرر سے بچیں۔ غرض اوروں کو حقیر سمجھنے کا جو مرض خلوت سے پیدا ہو سکتا تھا اس کا بھی علاج ہو گیا کہ جن کو یہ حقیر سمجھ کر الگ ہوا تھا وہی اہل برکت ہیں۔ انھیں کی بدولت اسے برکت جماعت حاصل ہوئی۔ نیز اسے اس پر بھی اب ناز نہ ہو گا کہ میرے اعتکاف کی وجہ سے اور لوگوں کو برکت پہنچی۔ کیونکہ یہ خیال کرلے گا کہ اصل میں ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے مجھے جماعت بلکہ اعتکاف کی بھی برکت حاصل ہوئی اور اس جماعت کا موقع ہونے سے مجھ کو اعتکاف کی اجازت ہوئی۔ تو اصل میں میں بھی ان کا محتاج ہوا۔ یہ پورا علاج ہے کبر و عجب کا۔ سبحان اللہ کیسی دوا ہے کہ پرہیز بھی ہے اور دوا بھی ہے۔

اسی طرح عاکفون بھی ایک حکمت پر دلالت کر رہا ہے۔ کہ عاکفون کے معنی حبس کے ہیں۔ عاکفون یہ بتلا رہا ہے کہ اس میں حبس نفس مقصود ہے۔ اس کا صلہ کبھی عن کے ساتھ آتا ہے اور کبھی فی یا علی کے ساتھ۔ یہاں صلہ لائے فی کے ساتھ' مطلب یہ کہ نفس کو مقید کر دو مساجد میں' جو بیت

اللہ ہیں۔ اب معنی عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ کے یہ ہوئے کہ عاکفون فی بیوت اللہ' محبوس ہوتے ہیں وہ اللہ کے گھروں میں۔ اور بیوت اللہ میں محبوس ہونا کس کے واسطے ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے لیے ہے۔ پس حقیقت وہ ہوئی جس کو امیر خسرو نے بیان کر دیا ہے۔

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب و گدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے' خدا کے لیے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمایئے)۔

اور جب اعتکاف کی یہ حقیقت ہے اور حقیقت اس عنایت کے لوازم سے ہے' تو عاکفون میں یہ بھی بتا دیا کہ جب تم ہمارے دروازے پر آ پڑو گے تو کیا ہم تم کو محروم کر دیں گے۔ تو ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے۔ ایک حکمت عاکفون میں اور بتلا دی جو گویا روح الروح ہے۔ روح تو خلوت ہے' اور خلوت کی روح ذکر اللہ ہے۔ کیونکہ حقیقت مذکورہ دال ہے ذکر اللہ پر بوجہ اس کے کہ جس کوچہ میں سب کو چھوڑ کر جا پڑیں گے' کیا اس کو دل سے بھلا سکتے ہیں۔ پس اس کی یاد ضروری ہوئی اور اس کے ساتھ اوروں کا چھوڑنا' اور یہی حاصل ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا۔ تو گویا اعتکاف میں نظر اسی پر مقصود رہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ تو حقیقت میں اعتکاف فنائے محض ہے۔ تو جس نے اس نیت سے اعتکاف کیا' وہ واقعی معتکف ہے' ورنہ جو شخص بلا اس کے رہا اس کا اعتکاف بلا روح ہے۔

پھر یہ رحمت دیکھیے کہ اعتکاف میں حاجتوں کو خدا نے منع نہیں کیا۔ ان کے قضا کرنے کے لیے مساجد سے باہر نکلنے کی اجازت بھی دے دی۔ پھر بھی اگر کسی سے نہ ہو سکے تو اس کا قصور ہے۔ مباشرت میں چونکہ حاجت خفیف ہے' اس لیے لَاتُبَاشِرُوْھُنَّ سے مباشرت کی ممانعت کر دی' اور کھانے پینے کی حاجت شدید ہے اس کے کرنے کی بھی اجازت دی' مثلاً مسجد کے اندر کھانے کی اجازت ہے اور لانے کی بھی اجازت دی۔ اور حاجت کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر کوئی خود بساطی ہے اور بساط اس کی اتنی ہی ہے کہ اسی پر گزر ہے تو اسے جائز ہے کہ وہ تجارت بھی مسجد میں کر لے مگر اسباب مسجد میں نہ لاوے۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت کا' خدا کے معاملات کو دیکھو کس قدر سہل ہیں۔ پھر بھی اگر ان سے کوئی تجاوز کرے تو پھر ایسے اعتکاف سے فائدہ کیا۔

ایک حکمت اعتکاف میں یہ ہے کہ اس میں شب قدر کی تلاش (ثواب ڈھونڈنا) بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: شب قدر کو طاق راتوں میں تلاش کرو۔

اور اس حکمت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معتکف کو اپنا ضروری سامان مسجد میں رکھنا جائز ہے مگر زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں کیونکہ اس سے تو وہ بھی گھر بن جائے گا۔ پھر جس طرح گھر میں عبادت و بیداری میں دشواری تھی وہی بات مسجد میں ہو گئی۔ سب کا حاصل یہ ہوا کہ مسجد میں تو گھر کے قصے سے

چھڑانے لائے تھے، وہاں تم نے اتنا بکھیڑا اٹھا دیا کہ وہ بھی گھر کی طرح ہو گئی۔ مسجد میں معتکف کو اتنا بکھیڑا نہ لے جانا چاہیے۔ بعضے آدمی ہوتے بھی ہیں بکھیڑیئے۔ گو گناہ تو نہیں مگر خلاف ادب ہے۔ مسجد میں آئے ہو گھر چھوڑ کے اگر تم نے اسے بھی گھر بنا لیا تو مسجد میں آنے کا کیا فائدہ ہوا؟ غرض نہایت مختصر سامان کے ساتھ مسجد میں آنا چاہیے بلکہ اپنے گھر میں بھی نہایت مختصر سامان سے رہنا چاہیے تو مسجد تو پھر خانہ خدا ہے۔ اس میں زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں۔

یہ پانچ راتیں ہیں جن میں احتمال ہے شب قدر کا، سبحان اللہ، عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ نے اس کی تلاش کے لیے مسجد میں پہنچا دیا۔ بھلا گھر میں اس کی کہاں فرصت؟ مسجد میں معتکف کو اس لیے لایا گیا کہ شب قدر کی تلاش سہل ہو۔ کیونکہ بہت سے آدمی ہوں گے، جب سب ایک ہی کام میں مشغول ہوں گے تو دل بھی لگے گا۔

اور اس میں بھی عجیب حکمت ہے کہ شب قدر کی تاریخ معین نہیں کی کیونکہ مقصود پانچ راتوں میں جگانا تھا۔ پھر، سبحان اللہ، اس میں یہ کیسا اعتدال ہے کہ متواتر پانچ راتوں میں نہیں جگایا، ایک رات جگایا اور ایک رات سلایا۔ اور پھر اس سونے میں بھی ثواب جگانے کا دیا۔ یہ بات میں اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں کہتا۔ حدیث سے ثابت ہے۔ سونا جب ذریعہ ہے جاگنے کا، اور وہ ذریعہ ہے عبادت کا، اور ہوا بھی ہے اسی عبادت کے قصد سے، تو اس میں کیوں ثواب نہ ملے گا۔

شب قدر نہایت قابل قدر چیز ہے۔ اس میں جاگنا چاہیے اور خدا کی عبادت کرنا چاہیے اور کوئی ساری رات جاگنا ضروری نہیں، جتنا جس سے ہو سکے جاگے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عادت سے کسی قدر زیادہ جاگے۔ اس عبادت شب قدر کی روح مشاہدہ ہے۔ اس میں حق جل وعلیٰ شانہ کی تجلی ہوتی ہے اور گو ہمیں ان تجلیات کا دکھائی دینا ضروری نہیں مگر اس کی پہچان اس سے ہوتی ہے کہ اس میں اور، اور راتوں میں یہ فرق ہے کہ اس رات میں بہ نسبت اور راتوں کے عبادت میں زیادہ جی لگتا ہے، قلب کو غفلت نہیں ہوتی اور کیوں ہو، وصل کے ساتھ ہجر جمع نہیں ہوتا ؎

شب قدر است طے شد نامہ ہجر سلام فیہ حتی مطلع الفجر

شب قدر میں نامہ ہجر لپیٹ دیا گیا ہے۔ اس میں سراپا سلامتی و برکت ہے طلوع فجر تک۔

اس رات کی یہ فضیلت ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا میں مَلٰٓئِكَہ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اس میں دو احتمال ہیں۔ یا تو اس میں فضیلت اس وجہ سے آئی ہے کہ اس میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں یا ملائکہ اس وجہ سے نازل ہوتے ہیں کہ اس میں پہلے سے فضیلت ہے، بہرحال جو بھی ہو ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ور بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل، ہم کھینچ لیں تب بھی، اسی طرح اس

میں بھی بہرحال فضیلت ہے۔اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اس رات سے محروم رہ گیا وہ بڑی دولت سے محروم رہ گیا۔یہ دن سال بھر کے بعد آتے ہیں، ان کی قدر کرنا چاہیے کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ۔یوں تو ہر رات میں من وجہ فضیلت ہے، یہ اس لیے کہتا ہوں کہ اگر کسی سے فوت ہو جائے تو اور ہی کسی رات میں کچھ کر لے۔گو وہ ویسی تو نہ ہوگی مگر کام بن جائے گا۔

ای خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی ہر شب شب قدر ست اگر قدر بدانی

(شب قدر کی نشانی کو تم کیا دریافت کرتے ہو، اگر قدر کرو تو ہر رات شب قدر ہے)۔

لیکن اس میں پھر بھی خصوصیت ہی ہے۔

اوپر جو ذکر کیا گیا کہ اس میں تجلی حق ہوتی ہے۔اس میں بھی دو احتمال ہیں یا تو اس شب کی فضیلت کے سبب اس میں تجلی ہوتی ہو اور یا خود تجلی کے سبب اس کی فضیلت ہوتی ہو۔حافظ شیرازی کے قول سے احتمال ثانی اَقرب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

آن شبقدر ے کہ گویند اھل خلوت امشب است یارب ایں تاثیر دولت از کدا میں کوکب است

(وہ شب قدر کہ اہل خلوت کہتے ہیں آج کی رات ہے، یارب! اس میں یہ فضیلت کس کوکب کی وجہ سے آئی)۔یعنی یہ فضیلت شب قدر میں کس کوکب کی وجہ سے آئی۔کوکب سے مراد تجلی حضرت حق جل وعلیٰ شانہ ہے مع ظہور۔بہرحال یہ وقت عزیز ہے، بڑے فیوض و انوار و برکات کا ہے۔اس میں جہاں تک ہو سکے اعتکاف کرو، اگر نہ ہو سکے تو ان پانچ راتوں میں جاگ ہی لو۔اگر تمام راتوں میں نہ ہو سکے تو بعض ہی میں جاگ لو۔بعض کے بھی بعض حصہ میں جاگ لو، تب بھی کافی ہے۔(ترتیب و تدوین: م-س)

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا

فتح مکہ، رمضان ۸ ہجری

شبلی نعمانی

جانشین ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض، توحید خالص کا احیا اور حرم کعبہ کا آلایش سے پاک کرنا تھا، لیکن قریش کے پے درپے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض سے روکے رکھا۔ صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لیے امن و امان قائم ہو گیا اور دلدادگان حرم ایک دفعہ یادگار ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے لیکن معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا۔ حلم و عفو و تحمل کی حد ہو چکی۔ اب وقت آگیا کہ آفتاب حق حجاب ہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائل عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا۔ ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا۔ صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا۔ دفعتاً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور روسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں۔ خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی۔ بنو بکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے۔ لیکن ان کے رئیس اعظم نوفل نے کہا، یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا، غرض عین حدود حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت ؐ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعتاً یہ صدا بلند ہوئی: اے خدا! میں محمد ؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے پیغمبر خدا ہماری اعانت کر اور خدا کے بندوں کو بلا، سب اعانت کے لیے حاضر ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا۔ تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔ (۱) مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔ (۲) قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔ (۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا: "صرف تیسری شرط منظور ہے"۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انھوں نے ابو سفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں۔ ابو سفیان نے مدینہ آکر آنحضرت ؐ کی خدمت میں درخواست کی۔ بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا۔ ابو سفیان نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہ زہراؓ کے پاس آیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے۔ ابو سفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا"۔ جناب سیدہ نے فرمایا: "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل؟" بالآخر ابو سفیان نے حضرت علیؓ کے ایما سے مسجد نبوی میں اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ ابو سفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت ؐ نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے۔ انھوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی۔ حضرت علیؓ (اور حضرت زبیرؓ حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثدؓ غنوی) کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں۔ خط آنحضرت ؐ کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی۔ حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں؟ لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا: عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہے کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔

حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا اس لیے انھوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ انھوں

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آپ ؐ نے قبول فرمایا۔

غرض ۱۰ رمضان ۸ ھ کو کوکبۂ نبوی ؐ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا۔ دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں۔ قبائل عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت ؐ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا۔ فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ تحقیق کے لیے انھوں نے حکیم بن حزام، ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو بھیجا۔ خیمہ نبوی ؐ کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا۔ حضرت عمرؓ جذبہ انتقام کو ضبط نہ کر سکے، تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہ رسالت میں آکر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آگیا۔ لیکن حضرت عباس ؓ نے جان بخشی کی درخواست کی۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا۔ حضرت عباسؓ نے کہا: عمر! اگر یہ شخص تمھارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: آپ یہ نہ فرمائیں، آپ جس دن ایمان لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعوے دار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز عفو نبوی ؐ ..... تھی۔ اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا: ”خوف کا مقام نہیں“۔

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا، اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے۔ چنانچہ غزوہ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس ؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا۔ قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، ہذیم، سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے۔ سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا: یہ کون سا لشکر ہے؟

حضرت عباس ؓ نے نام بتایا۔ دفعتاً سردار فوج حضرت سعد ؓ بن عبادہ ہاتھ میں علم لیے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے: آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے آخر میں کوکبہ نبوی ؐ نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیر ؓ بن العوام علم بردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ "حضور ؐ نے سنا؟ سعد ؓ بن عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے"۔ ارشاد ہوا کہ سعد بن عبادہ نے غلط کہا۔ آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعد بن عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ مکہ پہنچ کر آپ ؐ نے حکم دیا کہ علم نبوی ؐ مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالد ؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اس کو امن دیا جائے گا۔ تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالد ؓ کی فوج پر تیر برسائے۔ چنانچہ حضرت کرز بن جابر فہری اور حضرت حبیش بن اشعر اور حضرت سلمہ بن المیلا نے شہادت پائی۔ حضرت خالد ؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا۔ یہ لوگ ۱۲ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالد ؓ سے باز پرس کی، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قضائے الٰہی یہی تھی"۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور ؐ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ ابوطالب نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے، اس لیے وہی وارث ہوئے۔ انھوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اُس میں اتروں۔ اس لیے مقام خیف میں ٹھہروں گا جہاں قریش نے ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا۔

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا، اس کی آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزیں تھے، آنحضرت ؐ ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے: جآء الحق و زھق الباطل وجآء الحق ومایبدی الباطل ومایعید ان الباطل کان زھوقا حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیے جائیں۔ حضرت عمر ؓ نے اندر جا کر جس قدر

تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں۔ حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپ ؐ نے عثمان بن طلحہؓ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے 'کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا۔ آپ ؐ حضرت بلال ؓ اور طلحہ ؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ؐ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبہ فتح

شاہنشاہ اسلام کا یہ پہلا دربار تھا 'خطبہ سلطنت یعنی بارگاہ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی 'جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں بلکہ تمام عالم سے تھا۔

ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا ' اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا۔ ہاں تمام مفاخر 'تمام انتقامات ' تمام خونبہائے قدیم ' میرے قدموں کے نیچے ہیں ' صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اے قوم قریش ! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خدا ' دانا اور واقف کار ہے (الحجرات ۴۹ : ۱۳)۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے ' اس لیے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

روشن مستقبل کیسے؟

نئی نسل ...... روشن مستقبل کی اُمید ہے
اور یہ نسل عورت کے ہاتھ میں ہے

عورت جو بدل جائے تو بدل جائے زمانہ

آج بچیوں کی تربیت پر توجہ دیجئے
ملک و ملت کا کل روشن کیجئے

دخترانِ اسلام فاؤنڈیشن

اس روشن خیال کا عملی نمونہ ہے، جس کے تحت بچیوں کیلئے دینی و دنیاوی تعلیم کیلئے تین اقامتی تعلیمی ادارے

باغ، تراڑ کھل اور مظفر آباد میں قائم ہو چکے ہیں

جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم، جدید علوم اور مثالی تربیت دی جاتی ہے۔
دور دراز دیہاتوں سے طالبات کو صلاحیت کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بچیوں کے والدین بھی زرِ تعاون دیتے ہیں، لیکن فاؤنڈیشن کو ہر ماہ ایک خطیر رقم کی ضرورت ہے۔

ان اداروں کو چلانے کے لیے
تین نئے اداروں کے قیام کے لیے
قائم اداروں کی عمارات کے لیے۔ ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔
اپنے صدقات، عطیات اور زکوٰۃ، ہمیں ارسال کریں۔

اکاؤنٹ نمبر 1107-9 نیشنل بینک شالیمار پلازہ برانچ راولپنڈی

محمد حیات خان پوسٹ بکس نمبر 1703 جی پی او راولپنڈی

زوال ، انحراف اور نشاۃ ثانیہ

پروفیسر سید حسین نصر

جدیدیت (modernism) کے ظہور کے بعد کے مسلم ملکوں میں جدیدیت زدہ مسلمانوں کے ذہنوں میں بعض مخصوص مسائل ابھرنے لگے۔ یہ مسلمان جدت کو تو اپنا چکے تھے تاہم اسلام اور اس کی تاریخ سے بھی رشتہ توڑنا نہ چاہتے تھے۔ ان لوگوں میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ ان دینی اصطلاحات کو، جن کے مفہوم صدیوں سے واضح اور متعین چلے آتے ہیں، لاپرواہی سے اور مبہم انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ مغرب کی غالب فکر سے ان کے ذہن میں جو احساس کمتری پیدا ہوا ہے، اس کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے۔ مغربی معیارات اور افکار کی ذہنی غلامی یوں واضح ہوتی ہے کہ دینی الفاظ و تراکیب کو وہ مغرب میں مروج اور غالب خیالات کا جامہ پہنا دیتے ہیں، اور اس طرح اسلام کو جدید مغربی فکر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس طرح جو اسلام انھوں نے پیش کیا (یا کر رہے ہیں)، وہ دراصل فکر مغرب ہی ہے، جس میں اسلام کا صرف لبادہ، کچھ الفاظ و تراکیب، اور ایک کمزور سا جذباتی بندھن تو نظر آتا ہے، مگر اس میں اسلام کی وہ عقلی اور روحانی حقیقت مفقود نظر آتی ہے، جو اسلام کی اصل شناخت ہے۔ اس مضمون میں ہم ان تین اصطلاحات پر گفتگو کریں گے، جو اسلامی تاریخ اور آج کی اسلامی دنیا کے حوالے سے اکثر استعمال ہوتی ہیں، اور جدیدیت زدہ مسلمانوں کے فکری رویے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ اصطلاحات ہیں: ''زوال و انحطاط'' ''انحراف'' اور ''نشاۃ ثانیہ''۔

''زوال'' کی اصطلاح کو لیجیے، جو جدید مسلم مصنفین کثرت سے استعمال کرتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کے آغاز سے قبل اسلامی دنیا ''زوال پذیر'' تھی۔ سوال یہ ہے کہ ''زوال'' کس حوالے سے؟

کسی چیز کے عروج و زوال کو ناپنے کے لیے ایک معیار یا پیمانہ درکار ہوتا ہے، جس پر پرکھ کر ہی اسے ''عروج'' پانے والی یا ''زوال'' کا شکار کہا جائے گا۔ یہاں اگرچہ بعض لوگوں نے معیار، اسلام کے قرون اولیٰ کو بنایا ہے، تاہم اکثر لوگ، شعوری یا غیر شعوری طور پر مغرب کے نظام اقدار ہی کو عروج

و زوال کی کسوٹی بنالیتے ہیں۔ مثلاً سائنس کے مسئلے کو لیجیے۔ اکثر اہل مشرق کی طرح بہت سے "جدید مسلمان" بھی سائنس اور تہذیب کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے اور اس کی تہذیب و ثقافت کو پرکھنے کے لیے یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سائنس کا فروغ کس قدر ہے۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے وہ خود تاریخ سائنس کا دیا ہوا سبق بھی فراموش کر جاتے ہیں (۱)۔

اس خود ساختہ معیار عروج و زوال کے مطابق اسلامی تہذیب کے زوال کا نقطہ آغاز اس وقت سے تصور کیا جاتا ہے 'جب وہاں ممتاز سائنس داں پیدا ہونے بند ہوگئے۔ ("سائنس داں" کا تصور بھی وہی لیا جاتا ہے 'جو آج کا مغربی تصور ہے)۔ بہت سے مسلمان مصنفین اس وقت کا تعین بھی مغربی مورخین اور دانش وروں کی کتابوں سے کرتے ہیں۔ ان مغربی اہل قلم کا حال یہ ہے کہ ان کی اسلام کی عقلی و ذہنی زندگی سے دلچسپی اس دور تک محدود ہے 'جب اسلام 'مغرب کو متاثر کر رہا تھا۔

اس رویے کے مطابق فلسفے سے ریاضی تک 'اسلام کی ہر چیز ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) کے قریب اچانک پراسرار طور پر "زوال" کا شکار نظر آنے لگتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے ' جب مغرب اور اسلام کے عقلی روابط عملاً ختم ہو چکے تھے (۲)۔ بدقسمتی سے اس رائے کے حامل ہمارے ان جدید مسلم مصنفین نے اس سلسلے میں نہ تو کبھی ذاتی تحقیق کی زحمت کی 'اور نہ ہی بعض مغربی ماہرین کی حالیہ (اور نسبتاً کم معروف) تحقیق پر غور کیا' جو یہ بتاتے ہیں کہ نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں بھی مسلمانوں کا علم فلکیات میں اہم مقام رہا ہے 'نیز یہ کہ چودھویں صدی ہجری (اٹھارھویں / انیسویں صدی عیسوی) میں مسلمانوں کا علم طب 'ایران اور ہندستان میں بڑا جاندار تھا (۳)۔

"زوال" کا یہ مروج تصور 'جو "تہذیب" کے دنیاوی پہلو کے بارے میں مروج مغربی معیارات کے مطابق ہے 'روایتی اسلامی نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے 'جس کے مطابق قرن اول کا مدینہ ہی کامل ترین انسانی معاشرے کا نمونہ تھا 'کہ اسی کے معیار پر باقی تمام اسلامی معاشروں کو پرکھا جاسکتا ہے۔

اسی غلط تصور زوال کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں کے ذہن سکڑ کر کمزور ہوگئے ' انھیں خود پر ' اپنی ثقافت پر اعتماد نہ رہا۔ اسلامی دنیا پر زوال تو آیا ہے ' مگر یہ "بڑھاپے" کے تدریجی اور فطری عمل ' نیز عہد وحی سے بتدریج دوری کی وجہ سے ہوا ہے۔ مگر ہمارے یہ دانش ور ' زوال کی اس طرح تصویر کشی کرنے اور یہ بتانے کی بجائے کہ یہ انحطاط بالکل حالیہ ہے ' یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی دنیا ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) ہی سے زوال کا شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ وہ یہ بات فراموش کر جاتے ہیں کہ اگر یوں ہوتا ' تو یہ بات ممکن نہ تھی کہ اسلام آج تک ایک وسیع تہذیب کی

پرورش کر پاتا' اور ایک زندہ قوت کے طور پر باقی رہ جاتا۔ یہ لوگ اسلام کی زندہ جاوید روحانی روایت کو فراموش کر دیتے ہیں' جو تصوف کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ یہ اصفہان کی مسجد شاہ' استنبول کی نیلی مسجد' یا تاج محل جیسے فن تعمیر کے شاہ کاروں' صائب تبریزی اور جامی کے ادبی شہ پاروں اور شیخ احمد سرہندی "اور ملا صدرا" کی مابعد الطبیعیات اور علم کلام کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر زوال وہی ہوتا اور اسلامی دنیا کو زوال نے اسی تاریخ سے اپنی گرفت میں لیا ہوتا' جو ان جدیدیت زدہ مسلم مصنفین نے (جنھوں نے مغرب کے معیار عروج و زوال کاملاً اپنا رکھے ہیں) فرض کر لیا ہے' تو آج دنیا میں اسلامی تہذیب نام کی کوئی چیز باقی نہ ہوتی جس میں "جان ڈالنے" کی یہ کوشش کر رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب مرکھپ کر آثار قدیمہ میں شامل ہو چکی ہوتی' جیسا کہ بعض مستشرقین کی خواہش ہے۔

دوسرا لفظ ہے "انحراف"۔ اس کو متجد دین (جدیدیت کے پرستار) کم ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح عموماً ان مسلمان مصنفین کے ہاں نظر آتی ہے جو ہمارے روحانی اور مذہبی معیار کی موجودگی سے واقف ہیں' ایسا معیار جس پر اپنے معاشرے سمیت کسی بھی انسانی معاشرے کو جانا پرکھا جا سکتا ہے۔ لفظ "الدین" کے وسیع تر معنی میں "روایت" کا ذکر انحراف کے امکان کے ہم معنی ہے۔ انحراف کی اصطلاح کا اگر کوئی موزوں استعمال ہے' تو وہ مغربی تہذیب ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ شیخ عبدالواحد یحییٰ (رینے گینوں) کے الفاظ میں یہ تہذیب مغربی ایک مہمل عجوبہ نہ بھی ہو' تو ایک بڑا انحراف اور بے قاعدگی ضرور ہے (۵)۔ مگر ہم جن تجدد پسند مسلم مصنفین کا ذکر کر رہے ہیں' وہ اس لفظ (انحراف) کو اس حوالے سے استعمال کرتے ہوئے شرماتے ہیں' کیوں کہ ان کے پاس وہ معروضی معیار ہی نہیں' جس کے ذریعے کسی مخصوص دنیا کے اپنے زمانی و مکانی حالات کا تعین کرنے والے زمانی تغیر پر کوئی حکم لگایا جا سکے' کیوں کہ ایسے معیار کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود تغیر سے ماورا ہو۔ یہ بات تعجب انگیز ہے۔ کیوں کہ ہمارے اسلامی مصادر میں ایسا مواد موجود ہے' جس کی روشنی میں اس طرح کے معیار کی تشکیل ہو سکے' اور اس کے ذریعے معاصرین کے لیے قابل فہم زبان میں تنقید بھی وضع کی جا سکتی ہے۔

تیسری اصطلاح' جس کا ادب' آرٹ' سیاست غرض ہر شعبے میں اندھا دھند استعمال ہو رہا ہے' "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) ہے۔ ہمارے متجد دین اسلامی دنیا میں وقوع پذیر کم و بیش ہر طرح کے عمل کے لیے "نشاۃ ثانیہ" کی اصطلاح نہایت فراخ دلی کے ساتھ استعمال کر لیتے ہیں۔ معاصر عربی ادب میں اس کے لیے "النهضة" کا استعمال ہوتا ہے' اور بے تحاشا ہوتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ کے استعمال میں بھی ایک طرح کا فریب پوشیدہ ہے۔ اس لفظ کو پڑھ کر ہمارا ذہن

فوراً مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس تحریک نے یورپ میں یونانی اور رومی اصنام پرستی (paganism) کے ان عناصر کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا' جو روحانی طور پر مہلک تھے۔ تاہم قدیم روایت کے وہ مثبت عناصر جنھیں آبائے کلیسا' خصوصاً سینٹ آگسٹائن نے عیسائیت میں شامل کر لیا تھا' انھیں اس تحریک میں شامل نہ کیا گیا۔ ان عناصر نے عیسائی تہذیب کو وہ نقصان پہنچایا کہ وہ صحیح عیسائی تہذیب کی حیثیت سے پھلنے پھولنے کے طبعی مدارج تک پہنچ ہی نہ سکی۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ کا ذکر آئے تو پرومیتھائی (promethean) اور طیطانی (titanesque) روح اور رویے (۶) کا دوبارہ سر اٹھانا بھی ضرور یاد آئے گا' جو اسلام کے رویے کے بالکل متضاد ہے (۷)۔

اب صورت حال یہ ہے کہ آج کے مسلمان عام طور پر جس چیز کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کہہ دیتے سمجھ لیتے ہیں' وہ کسی نہ کسی انداز میں انھی قوتوں کی حیات نو ہوتی ہے' جن کے استیصال کے لیے اسلام آیا تھا۔ یہ وہی قوتیں ہیں' جنھیں اسلامی روایت میں جاہلیت کے عہد سے منسوب کیا گیا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کسی خاص شعبے میں اور جزوی طور پر بھی اسلام میں کسی "احیا" کا امکان ہی نہیں۔ مثلاً کسی بڑے بزرگ یا ولی اللہ کے ہاتھوں مسلم دنیا کے کسی خاص حصے میں روحانیت کا احیا ہو سکتا ہے (۸)' اسلامی فنون میں کسی خاص شعبے کی فنی ہیئت کی کوئی نئی تشکیل ہو سکتی ہے' کسی دانش ور کے ہاتھوں' اسلام کی فکر کے کچھ مخصوص پہلوؤں کا صیقل ہو جانا بھی ممکن ہے' مگر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مفکر خود بھی اسلام کی ذہنی روایت کا ٹھیک ٹھیک ادراک رکھتا ہو (۹)۔ بدقسمتی سے آج کل اسلام کے "احیا" کے نام پر جو کام ہو رہے ہیں' وہ حقیقتاً احیاے اسلام نہیں۔ اکثر کھلی ہوئی خلاف اسلام فکر کو اسلامی فکر کی "نشاۃ ثانیہ" قرار دے کر اس کی خوب واہ واہ ہوتی ہے۔ شریعت کے صریحاً مخالف عمل کو بھی اسلام کی سماجی نشاۃ ثانیہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کسی نئے رجحان / فکر کو "نشاۃ ثانیہ" قرار دینا ضروری ہو' تو کم از کم اس کے ساتھ "اسلامی" کا لفظ تو نہ چپکایا جائے۔ یہاں بھی وہی اسلام کے اصل معیارات کے ادراک سے محرومی نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے جدید دنیا کی گمراہیوں کے شکار یہ لوگ اسلامی دنیا میں ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو نشاۃ ثانیہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے' جیسے مغربی دنیا اور اس کے زیر اثر دوسرے ملکوں میں اہل مغرب سے متاثر لوگ ہر تبدیلی کو "ترقی" اور "پیش رفت" قرار دے ڈالتے ہیں' خواہ اس تبدیلی کے زیر اثر روح انسانیت کی تذلیل اور تحقیر ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔

ان سب میں ایک غلطی مشترک ہے۔ یہ غلطی اس لیے لاحق ہوتی ہے کہ معروضی' اٹل اور زمان و مکان سے ماورا اسلامی اصولوں کی بصیرت ہی سے یہ لوگ محروم ہو گئے ہیں۔ اسلام کے انھی اصولوں کی روشنی میں کسی عہد میں انسانی معاشرے کے کسی عمل یا کسی دور کے بارے میں ہم یہ کہہ

سکتے تھے کہ وہ زوال پذیر ہے' اس میں انحراف نظر آتا ہے' یا نشاۃ اور "ترقی" صحیح معنوں میں اسلامی احیا کی صفات لیے ہوئے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ذات مطلق (الاحد) کے حوالے کے بغیر کسی مقید اور موضوعی یا اضافی (relative) کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ غیر متغیر کے ذریعے ہی اس چیز کا بھاؤ تاؤ اور جانچا جاسکتا ہے' جو متغیر اور متحرک ہے۔ قائم و دائم ہستی کے حوالے کے بغیر تغیرات کی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن ہی نہیں' یہ کوشش ایک فلسفیانہ بے بصیرتی ہوگی۔

اب صورت یہ ہے کہ مغرب کی غلطیوں کی اندھی پیروی نے' جو خود بھی "القیوم" کی بصیرت سے عاری ہو چکا ہے' ہمارے ان "جدیدیت کا شکار" مسلم مفکرین اور اہل قلم کے پاس نہ تو وہ ذہنی استعداد اور بصیرت باقی چھوڑی ہے' جس سے وہ اشیا کے غیر متغیر اصول (جواہر یا اعیان ثابتہ) کا ادراک کر سکیں (قرآن انھیں "ملکوت" کے نام سے پکارتا ہے) اور نہ ہی ان میں وہ راسخ ایمان موجود ہے' جس کی مدد سے وہ روایت نبویہ (یعنی سنت اور حدیث) سے حاصل ہونے والی مثال پر عامل ہو سکیں اور اس کے دیے ہوئے معیار پر ثابت قدم رہ سکیں۔

چوں کہ اشیا کے غیر متغیر اصولوں تک رسائی کے راستوں میں پہلا طریق ذہنی اور روحانی نوعیت کا ہے' اس لیے ہمارے مجددین جب اس سے انحراف کرتے ہیں' تو انھیں عام لوگوں کی طرف سے کسی خاص مخالفت یا مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا' (کیوں کہ عام لوگوں کی ذہنی سطح ہی ایسی نہیں کہ وہ اس کے مضمرات کو سمجھ سکیں) اس لیے یہ اپنی پوری قوت اور توانائی روایتی اسلام کے غیر متغیر اصولوں کو ڈھانے میں صرف کرتے ہیں۔ یہی غیر متغیر اصول عام مسلمان کے "ایمان" کی اصل ہوتے ہیں' اس لیے ان پر زد پڑتی ہے تو عام مسلمان کی طرف سے مخالفت لازماً ہوتی ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں ان مجددین کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے: ان معروضی اسلامی معیارات یا کسی شے کی قدر و قیمت متعین کرنے والے ان اصولوں کو منہدم کر دیا جائے' جن کے ذریعے آج کے مسلم معاشرے اور دنیائے جدید کو پرکھا جانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ان معروضی اسلامی اصولوں سے روگردانی کی جو خواہش آج کے "مسلم مجددین" میں نظر آتی ہے' اس کا سارا زور اس پر صرف ہوتا ہے کہ کسی طرح سنت نبوی اور حدیث نبوی ؐ کی اس معنویت کو کمزور کر دیا جائے جو تاریخ کے تمام ادوار پر محیط نظر آتی ہے۔ اس مقصد کے لیے "تاریخی تنقید" کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے' جس کے ذریعے ہر اس چیز کا انکار کر دیا جاتا ہے جو کہیں تحریری طور پر موجود نہ ہو۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی اور اجتماعی' دونوں طریقوں سے مسلمانوں کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک کامل نمونہ عطا کر دیا ہے (جسے قرآن مجید "اسوہ حسنہ" کہتا ہے)۔ جب تک آپ ؐ کی سنت کا احترام ہو گا' اسے ایک معیار کے طور پر باقی

رکھا جائے گا، اس وقت تک دراصل ملت اسلامیہ میں اللہ کا مقرر کردہ وہ معیار بھی قائم رہے گا، جس کے ذریعے ہی انسانی رویے اور عمل کو حقیقتاً پرکھا جاسکتا ہے۔ یوں کہ یہی اسوۂ حسنہ کتاب اللہ کے ساتھ مل کر انسانی معاشرے کی اجتماعی زندگی، نیز افراد کی داخلی مذہبی زندگی کی اساس کے لیے لوازم مہیا کرتا ہے (۱۰)۔ ذخیرۂ حدیث کی صحت پر تنقید اور اسے ناقابل اعتبار ٹھیرانے کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی اس کسوٹی ہی کو غیر معتبر ٹھیرا دیا جائے، جس کے ذریعے مسلمان اپنے معاملات کو پرکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو اس کا شعور بھی نہ ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں، مگر عملاً اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے لیے جدیدیت کی نقالی میں آسانی ہو جاتی ہے، اور اپنی خواہشوں کی پیروی یا زمانے کے ہر آن بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے میں دشواری نہیں ہوتی، خواہ یہ طور طریقے کیسے ہی ابلیسی ہوں۔ یہ سارا عمل "اسلامی نشاۃ ثانیہ" کے نام پر کیا جاتا ہے، اور ان تمام لوگوں پر، جو مغربی تہذیب کے گھٹیا، بازاری چلن کی اندھی پیروی کا انکار کرتے ہیں، رجعت پرست اور زوال پذیر کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔

متجددین، اسلام کے ماضی اور حال کے بارے میں جو مبہم اور عموماً شرمناک فتوے دیتے ہیں، ان کا ان کوششوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے جن کے ذریعے وہ قرآن و سنت کی دی ہوئی کسوٹی اور معیارات کو دھندلا دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے دین دار اور اہل استقامت مسلمان، حدیث اور سنت میں دیے گئے معیار پر اسی لیے زور دیتے ہیں کہ اس کے بغیر خود قرآن کے پیغام کے کئی حصے ناقابل فہم ہو کر رہ جائیں گے۔

کہا جاسکتا ہے کہ زوال، انحراف اور نشاۃ ثانیہ جیسی اصطلاحات کے مروجہ استعمال پر تنقید بجا، لیکن اگر ہم قرآن و سنت کو سند مان لیں، اور اسلامی روایت کو قبول کر لیں، تو ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہو گا؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب اس سے بالکل مختلف ہو گا، جو اسلام کے متجددین پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے حوالے سے "نشاۃ ثانیہ" کے معنی صرف اسلامی اصولوں اور معیارات کے از سرِ نو ظہور کے ہیں۔ ہر اوٹ پٹانگ نظریے کو اسلام سے وابستہ کرنے کو نشاۃ ثانیہ کہنا غلط ہو گا۔ زندگی کی ہر لہر کو حیات روحانی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا، اور ہر وہ عمل جو مسلم اقوام میں ظہور پذیر ہو، لازماً اسلامی عمل نہیں ہو گا، خصوصاً آج کے دور میں جب "الحق" پر کہر چھا چکی ہے۔ اسلامی اصطلاح میں نشاۃ ثانیہ، تجدید دین کا وہ عمل ہے، جو اپنے روایتی معنوں میں مجدد ہی سے ظہور میں آسکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں، جہاں کسی مجدد نے اپنے کار تجدید سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ مگر ایسا مجدد ہمیشہ خود بھی صحیح اسلامی اصولوں کا کامل نمونہ ہوتا ہے۔ انھی اصولوں کی بازیافت کر کے

اور ان پر تنقید کے ذریعے وہ صورت احوال کی اصلاح کرتا ہے مگر اس میں اور آج کل کے مصلحین میں بڑا فرق ہے۔ آج کے مصلح تعمیر کی بجائے تخریب کے ہرکارے ہیں۔ یہ کسی اسلامی روایت کے کسی اٹل پہلو کو کسی عارضی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اس مصلحت کے بارے میں ان کا عام طور پر دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ "یہ زمانے کی ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں"۔

اگر ایسے "مصلحین" تاتاریوں کی یلغار کے دور میں اور اس کے فوراً بعد ابھرتے تو نہ جانے اسلام کی کیا صورت بن جاتی۔ یقیناً وہ مسلمانوں کو یہی مشورہ دیتے کہ منگول فاتحین اور ان کے طور طریقوں کی پابندی ہی "مصلحت" اور "ضرورت زمانہ" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی نشاۃ ثانیہ، سچے اور کھرے اسلامی اصولوں کی بازیافت اور ان کے از سرنو رواج کا نام ہے۔ کسی بھی بدلتے ہوئے فیشن کی اتباع کو نشاۃ ثانیہ نہیں کہہ سکتے۔

مندرجہ بالا معروضات سے ایک سچی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی ایک شرط تو واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ شرط یہ ہے کہ ہم مغرب کے اثر سے آزاد ہو جائیں، اور اس سب سے بیزاری کا اظہار کریں جو مغربی فکر و تہذیب کا خاصہ ہے۔ جدیدیت کے اثرات سے دور (اور محفوظ) ایک مسلمان کو شاید ایک روحانی تجدید کا تجربہ ہو سکتا ہے، چاہے وہ شخص دنیائے جدید سے کتنا ہی بے خبر ہو۔ مگر ایک مسلم دانش ور اور مذہبی راہ نما کے لیے، جو اسلامی دنیا میں ایک ذہنی اور سماجی احیا کا خواہش مند ہے، یہ بھی لازم ہو گا کہ وہ پہلے جدیدیت پر تنقیدی نظر ڈالے اور دنیائے جدید کا ایک وسیع تناظر میں تنقیدی جائزہ لے۔ اس کے بغیر اس کے لیے ممکن نہ ہو گا کہ اسلامی دنیا کی ذہنی یا سماجی سطح پر نشاۃ ثانیہ کے لیے کوئی پیش رفت کر سکے، کیوں کہ اسلامی دنیا آج مغرب اور اس کی پروردہ جدیدیت کے زبردست دباؤ کا شکار ہے۔ ایک طرف تو ہم اسلامی نشاۃ ثانیہ کی بات کریں، اور ساتھ ہی ان فکری معیارات کو بھی قبول کر لیں جو مغرب ہمیں دیتا ہے، تو ہمیں ایک سراب کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔ خالص اسلامی فکر، اور اس کی روشنی میں ایک لائحہ عمل کی تشکیل، جدید دنیا کے گہرے فہم اور اس پر بالغ نظری کے ساتھ تنقیدی رویے ہی سے ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلامی قانون اور فقہ اسلامی کے میدان میں صحیح اجتہاد اور درست فتویٰ اس ذہن کی رسائی سے ماورا ہے، جو جدیدیت کے عقائد کو قبول کر کے خود بھی تبدیل ہو چکا ہو۔ گذشتہ ایک صدی سے "مسلم مجددین" اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے بارے میں شور و غوغا کر رہے ہیں، مگر ابھی تک ایسی کوئی چیز منصہ شہود پر موجود نہیں۔ کم از کم ہمارے "جدیدیوں" کے ہاں سے تو کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہو سکی۔ اس کی بڑی وجہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں: یہ لوگ تنقیدی نظر سے عاری ہیں،

دنیائے جدید کا گہرا فہم بھی نہیں رکھتے اور ان وسائل سے بھی تہی دامن ہیں' جو دنیائے جدید کی آنی جانی اور روز بدلتی ہوئی اقدار کو اسلام کے ابدی اصولوں پر جانچنے پرکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی جانب سے بولنے والے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواہش مند لوگ مغرب کے مقابلے میں احساس کمتری لیے ہوئے گفتگو کرنا چھوڑ دیں' اور معذرت خواہانہ رویے کو ترک کر کے خود پیش قدمی کریں' اور جدید دنیا کے طلسم کدے پر اسلام کے مابعد الطبیعیاتی فرقان کی وہ ضرب لگائیں' جو خالص ترین صورت میں کلمہ شہادت میں موجود ہے:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں' لا الہ الا اللہ

اس منظرنامے کے حوالے سے "زوال" اور "انحراف" جیسے الفاظ کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ زوال' نام ہے ایسی حالت کا' جس میں کوئی قوم یا گروہ ایک مقررہ معیار سے گر جائے۔ زوال کے تصور میں یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ معیار کو نہیں بدل رہے ہیں' بلکہ اسی پر جانچ اور پرکھ رہے ہیں۔ اور انحراف کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس معیار ہی کو ترک کر کے اپنے لیے کوئی دوسرا پیمانہ اختیار کر رہے ہیں۔

زوال کی دو قسمیں ہیں: زوال افعال اور زوال منفعل۔ مشرق کی تہذیبوں پر گذشتہ چند صدیوں سے جو زوال چھایا ہوا ہے' وہ زوال منفعل ہے اور اول الذکر زوال وہ ہے' جس کا شکار خود مغرب ہے (۱۱)۔ مغرب کی حرکی اور فعال فطرت کی وجہ سے یہ زوال حقیقتاً انحراف بن گیا ہے۔ بہت سے مسلمانوں اور مشرق کے اکثر لوگوں نے اس فعالیت اور حرکت ہی کو سچی درست زندگی سمجھ لیا ہے' محض اس وجہ سے کہ اس میں مشرق کی بے عملی اور انفعالی زوال کے مقابلے میں حرکت اور زندگی نظر آتی ہے' مگر اب صورت حال یہ ہے کہ آج بہت سے جدیدیت زدہ مشرقیوں کی چشم حیراں کے آگے' مغرب کا یہ انحرافی زوال ایسی شکل میں متشکل ہو رہا ہے کہ وہ بھی اسے زوال اور تباہی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتے۔ صاف نظر آتا ہے کہ جدید مغربی زندگی کا خط منحنی (curve) جس کی ابتدا قرون وسطیٰ میں اس وقت ہوئی تھی جب مغرب نے انسان کی معمول کی روحانیت مسترد کر کے اسے پس پشت ڈال دیا تھا' اب "نشاۃ ثانیہ" سے گزر کر انحراف اور اس طرح ایک "زوال" کو پہنچ رہا ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں اس انحرافی زوال کو بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

"اسلامی جدیدیئین" (جنھیں ہم متجددین بھی کہہ آئے ہیں) نے اسلام کی جو تعبیر پیش کی ہے' اگر اس کا گراف بنایا جائے' تو وہ زوال سے "نشاۃ ثانیہ" اور وہاں سے "انحراف" کی طرف جائے گا۔ اس کے بعد پھر زوال کا ایک مرحلہ درپیش ہو گا' مگر یہ اس زوال سے مختلف ہو گا' جسے ذہن میں رکھ کر' اور جس کے علاج کے لیے ان لوگوں نے حرکت شروع کی تھی۔ خوش قسمتی سے اسلامی روایت کا

''اجماع'' اسے مسترد کرتا آیا ہے۔

دونوں طرح کے زوال سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ یہ کہ پرفریب راستوں کو چھوڑ کر اسلام کے ابدی اور غیر متغیر اصولوں پر نظر رکھی جائے اور انھی سے وابستگی کو مستحکم کیا جائے کہ یہ آنی جانی تحریکوں سے بالا ہیں۔ انھی اصولوں کی کلید سے ہر اس صورت حال کی کشائش کی جائے' جس کا مسلمانوں کو سامنا ہو' اور انھی کی کسوٹی پر ہر اس ''دنیا'' کو پرکھا جائے جو ہمارے مقابل ہو۔ کسی فانی ''دنیا'' یا زمان و مکاں کے گزرتے ہوئے حوادث کو اسلام کی تعیمات اور اصولوں کی سچائی کے لیے کسوٹی بنالینا ایک الٹا کام ہو گا' جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی جوت دی جائے۔ اس غلطی کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہم بھی اس راہ گمرہی پر چل پڑیں گے' جس پر مغرب چل پڑا تھا' اور جس کے نتیجے میں وہ اس پیچیدہ صورت حال کا شکار ہے کہ مغربی تہذیب کے ساتھ کرۂ ارض پر وجود انسانی کی بقا ہی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

مسلمان دانش وروں کے لیے کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ جدید مغرب کے ان مراحل کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں' جو اسے موجودہ بحران سے دوچار کر چکے ہیں اگر وہ اسلام کی حمایت کرنا چاہتے ہیں' اور اس کی حیات نو کے خواہش مند ہیں' تو وہ یہ یاد رکھیں کہ یہ ایک آسان کام نہیں۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ انھیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حق پر موت' باطل کی زندگی سے بہتر ہے۔ اگر ملت اسلامیہ کی تجدید حیات مطلوب ہو' تو یہ ایک ایسی زندگی کی تجدید ہونی چاہیے' جس کی جڑیں عالم قدس میں مضبوطی سے پیوست ہوں۔ زوال اور انحراف سے بچنے اور ایک حقیقی نشاۃ ثانیہ تک پہنچنے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کہ اپنی زندگی اور مسائل کو وحی ربانی کے بتائے ہوئے ان اصولوں کے مطابق مرتب کیا جائے' جو ہمیشہ سے مستند اور صحیح ہیں۔ اور ہمیشہ ہی ایسے رہیں گے مگر ان اصولوں کا اطلاق' باہر کی دنیا اور دوسروں پر کرنے سے پہلے اپنی ذات پر کرنا ہو گا۔ انسان اس وقت اپنے گردوپیش کی دنیا کو دوبارہ زندہ کرنے کے قابل ہوتا ہے' جب وہ پہلے خود حیات نو حاصل کر چکا ہو۔ آج کے تمام سچے مصلح' جدید دنیا کے ناکام مصلحین (جن میں بعض نیک نیت بھی تھے) کی ناکامیوں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اور وہ سبق یہ ہے کہ دنیا کی حقیقی اصلاح کا آغاز خود اپنی اصلاح سے ہونا چاہیے۔ جس نے خود کو فتح کر لیا' اس نے دنیا کی تسخیر کر لی اور جس شخص کی ذات میں اسلام کے دیے ہوئے اصولوں کی ... ان کی پوری وسعت کے ساتھ تجدید ہو گئی' اس نے اسلام کی حقیقی ''نشاۃ ثانیہ'' کے لیے سب سے بنیادی قدم اٹھا لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف وہی شخص اپنے گردوپیش کی دنیا کے جسد مردہ میں روح پھونک سکتا ہے' اور اسے نئی زندگی عطا کر سکتا ہے' جو ذات الٰہی ''الحق'' میں دوبارہ زندگی پا چکا ہو۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

[جس کا دل عشق (الٰہی) سے زندہ ہو گیا، اسے ہرگز موت نہیں آتی۔ لوح عالم پر ہماری ہمیشگی کے نقوش ثبت ہیں]۔

اس دنیا کی وسعت اور حدود کیا ہوں گی، اس کا انحصار مشیت الٰہی پر ہی ہے۔

(ترجمہ: سہیل عمر۔ تلخیص و تسہیل: پروفیسر عبدالقدیر سلیم)

حواشی

(۱) دیکھیے: سید حسین نصر، اسلام میں سائنس اور تمدن، جہاں اس مسئلے کا تفصیلی محاکمہ کیا گیا ہے، خصوصاً تعارف میں، صفحہ ۲۱۔ Science and Civilization in Islam

(۲) گو عثمانی ترکوں اور یورپ کے مابین روابط تھے مگر ان کی نوعیت اس تبادلہ عقلی سے بالکل مختلف تھی جس نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ بدل کر رکھ دی تھی۔

(۳) فلسفہ اسلام کی صورت حال اور بھی حیران کن ہے۔ اس لیے کہ فلسفہ اسلام اور اسلامی ماوراء الطبیعیات کا فی الحقیقت کبھی زوال ہوا ہی نہیں۔ دیکھیے: سید حسین نصر Islamic Studies باب ۸ اور باب ۹۔ نصر "ایران میں اسلامی فلسفے کی روایت اور جدید دنیا کے لیے اس کی معنویت" نیز نصر، "ایران اور اسلامی فلسفے کا مستقبل"۔

Studies in Comparative Religion Winter 1972. pp 31-42

(۴) اہل مغرب کے لیے خاص طور پر سترہویں صدی کے بعد سے "تہذیب" کلیتاً انسان سے متعلق بلکہ فی الاصل انسان خاکی کی خود کو ترقی دینے کی کوشش کے مترادف ہو چکی ہے۔ لوئی چہار دہم کے ساتھ یہ رویہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ دیکھیے:

F.Schuon: "Remarks on Some Kings of France", Studies in Cómparative Religion. Winter 1972 pp 211

(۵) دیکھیے: دنیائے جدید پر گینوں کی دو بنیادی تصانیف:

Crisis of the Modern World Reign of Quantity and the Sign of Times

نیز دیکھیے F.Schuon کا ماہرانہ تجزیہ Light on the Acient Worlds

(۶) یونانی صنمیات کے مطابق پرومیتھوس (Prometheus) وہ باغی ہیرو ہے، جو دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف آسمانوں سے آگ چرا کر لے آیا۔ اس نے انسانوں کو اس کا استعمال اور بہت سے مفید فنون سکھائے۔ سزا کے طور پر (یونانیوں کے) خدائے اکبر زیوس (Zeus) نے ایک چٹان کے ساتھ زنجیر میں باندھ دیا تھا۔ ہیراکولیس نے اسے رہائی دلائی۔ طیطان (Titans) بھی یونانی صنمیات میں بغاوت کی علامت ہیں۔ یورے نس اور زمین کے ان دیوہیکل بیٹوں نے زیوس دیوتا کے خلاف

بغاوت کی تھی 'اور زیر زمین قید کر دیے گئے تھے (ع-ق-س)

(۷) ہر وہ مسلمان جس کا ذوق فن پوری طرح نہیں تباہ ہو چکا' نشاۃ ثانیہ کے اور سترہویں اٹھارہویں صدی کے بے ڈھنگے آرٹ اور فن تعمیر کی دنیاوی نوعیت سے گھن کھائے گا' خواہ یہ فن مذہبی قسم کا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ یہ آرٹ جو مسلمان نظارہ کنندہ کو اتنا غیرروحانی اور دنیاوی لگتا ہے ' صرف رب السموات کے خلاف اس بغاوت کا عکس ہے جو نشاۃ ثانیہ کی انسان پرستی میں رچی ہوئی تھی۔ اور جو مغرب میں انسان کو مظہر الٰہی (Imago Dei) سمجھنے والے روایتی تصور انسان کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

(۸) اس قسم کے احیا کی مثال کے طور پر اس صدی کے آغاز پر عظیم الجزائری صوفی مرشد شیخ العلوی کے منظر عام پر آنے کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے: ابوبکر سراج الدین۔

Martin Lings. A Sufi Saint of the Twentieth Century

(۹) دیکھیے: H. Corbin, The Force of Traditional Philosophy in Iran today.

(۱۰) حدیث نبوی کی معنویت اور اس کے جدید ناقدین کے رد کے لیے دیکھیے:

S.H. Nasr: Ideals and Realities of Islam, pp 79ff.

F.Schuon: Understanding Islam, Ch. 3

S.M Yusuf: An Essay on the Sunnah, Lahore, 1966.

(۱۱) زوال سب تہذیبوں پر آیا ہے 'مگر اس زوال کے انداز الگ الگ رہے ہیں۔ مشرق کا زوال انفعالی ہے اور مغرب کا حرکی۔ مشرق کا زوال اس کی لغزش سے ہوا کہ اس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مغرب کا زوال زیادہ سوچنے اور غلط سوچنے سے ہے۔ "مشرق حقائق پر محو خواب ہے: مغرب گمراہیوں میں زندہ ہے"۔

F.Schuon: Spiritual Perspectives and Human Facts. p 22.

52

تحریکِ اسلامی

آج کے قابلِ غور مسائل

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

تحریک اسلامی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ظاہری حرکت اور بعض اوقات ہلچل کے باوجود دنیا میں تحریک اسلامی کو ایک لمحہ فکر میں ٹھٹکے ہوئے ہونے سے تعبیر کرنا درست ہو گا۔ یہ ٹھٹک جانا' نہ بلاسبب ہے نہ نامناسب اور بے موقع۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ایسا ہونا ناگزیر تھا اور یہ امر خوش آیند ہے کہ اس کا شعور عام ہو چلا ہے۔ جن اہم سوالات نے اس مسافر کو جو ابتداً بڑے ذوق و شوق سے مگر کچھ عرصے سے جھجکتا ہوا ایک راہ پر چلا جا رہا تھا اب رک کر پیچھے دیکھنے اور آگے بڑھنے سے پہلے راہ متعین کرنے پر مجبور کر رہا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ وہ تحریک جو تبلیغ و اشاعتِ افکار' پھر تنظیم اور سیاسی جدوجہد کا طریقہ اختیار کر کے آگے بڑھی تھی' ان حالات میں کیا کرے' جب حکمراں قوتیں ان میں سے کسی بات کی اجازت نہ دیتی ہوں۔

۲۔ مذکورہ صورت حال کے علاج کے لیے جمہوریت کی بحالی کو مقصود بنا کر اس پر قوتیں صرف کرنا ایسی صورت میں کس حد تک مفید ہو سکتا ہے جب کہ عوام کی غالب اکثریت ناخواندگی اور جہالت' اندھی تقلید اور جذباتیت نیز معاشی مفلوک الحالی اور مفادات محفوظہ (Vested Intersts) کی کاسہ لیسی کے سبب اپنے حق رائے دہی کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے سے بھی قاصر رہ سکتی ہو۔

۳۔ تحریک ان ممالک کی نسبت عملاً کیا موقف اختیار کرے جو اسلامی نظام قائم کرنے کے دعوے میں اس سے پیچھے نہیں مگر خود اسے آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتے۔

ان تینوں سوالات کا تعلق تو تحریک کی حکمت عملی (Strategy) سے فوری قسم کا ہے' جن کا کوئی واضح جواب دیے بغیر آگے بڑھنا محال ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے امور و مسائل بھی ہیں جن میں یکسوئی ضروری ہو گئی ہے۔ ان امور و مسائل کے ذکر سے پہلے ان کی تمہید کے طور پر یہ کہنا ضروری ہے کہ چالیس سالہ فکری کوششوں کے باوجود سماجی علوم اور انسانی زندگی کی تعمیر نو سے متعلق جو مواد

پیش کیا جا چکا ہے اس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک گروہ اب بھی مطمئن نہیں ہو سکا ہے، اور بہت سے ایسے سوالات اٹھائے جا چکے ہیں جن پر غور و بحث کی ضرورت باقی ہے۔ بہت سے امور میں ابھی کوئی ایسی رائے نہیں بن سکی ہے جس پر تحریک اسلامی کے حلقے متفق ہوں یا عصر حاضر کے تعلیم یافتہ مسلمان مطمئن ہوں۔ خاص طور پر معاشی اور معاشرتی زندگی کے باب میں یہ امر اب بھی وضاحت طلب ہے کہ اسلام کی امتیازی دین (Contribution) کیا ہے اور اسے قبول کرتے ہوئے دور جدید کے مسلمان انسانی عقل و تجربہ اور معاصر نظاموں سے اخذ و ترک کا طریقہ کس حد تک اختیار کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل امور و مسائل کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ابھی تک یہ تحریکیں عام انسانوں کو مخاطب کر کے ان کے کسی معتد بہ گروہ کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ حالانکہ وہ اس دعوے کے ساتھ آگے بڑھی تھیں کہ اسلام دین انسانیت ہے، انسان کو اسلام کی ضرورت ہے اور اسلام ہی جدید انسان کے دکھ درد کا مداوا فراہم کر سکتا ہے۔ آج مسلمانوں اور عام انسانی دنیا کے درمیان ذہنی سطح پر عمل اور ردعمل کا جو کھلا عمل مسلسل جاری ہے اس کے پیش نظر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم دنیا پر کسی نمایاں فکری اثر (Impact) کے بغیر مسلم دنیا کو اسلام کے حق میں اس حد تک یکسو کر لینا دشوار ہو گا کہ وہ اسے اپنی اجتماعی زندگی کی اساس بنا لیں۔ اگر عام انسانی فکر، بالخصوص ان امور کی بابت افکار پر، جو سماجی علم کا میدان بحث ہیں، اسلامی اثرات مرتب ہو جائیں تو مسلم دنیا پر بھی اس کے دوررس اثرات پڑ سکیں گے۔

ذیل میں جن امور و مسائل کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ سماج کے لیے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی نسبت سے تحریک اسلامی کا موقف مخاطب کے قبول یا عدم قبول کا سبب بن سکتا ہے۔

۱۔ تحریک اسلامی کے طریقہ کار میں اشاعت افکار سے زیادہ زور اسلامی قدروں کے عملی رواج پر دینا افکار و تصورات کو ذہنوں میں جاگزیں کر دینے اور عملی رویہ تبدیل کر کے انسانوں کو اسلامی قدروں کی تحصیل میں لگا دینے میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر کو ثانی الذکر کا ذریعہ بنانا ناگزیر ہے۔ لیکن مطلوبہ نتائج کا ظہور تمام تر صرف تبلیغ و اشاعت افکار سے عمل میں نہیں آ سکتا۔ دوسری طرف داعی گروہ اگر معاشرہ میں اعلیٰ اقدار حیات کو رواج دینے کی عملی کوشش میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لے تو اس سے اسلامی افکار و تصورات کے قبول عام کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ اس گروہ کو معاشرے میں یہ شہرت حاصل ہونی چاہیے کہ یہ سارے انسانوں کو یکساں طور پر آزاد سمجھتا ہے اور کسی فرد یا گروہ کو دوسروں پر حکومت جتانے کا حق دار نہیں سمجھتا بلکہ اجتماعی امور کے باہمی مشورہ سے طے پانے کے اصول پر کاربند ہے۔ وہ دولت کو خدا کی امانت سمجھ کر اعتدال کے ساتھ اپنے صرف میں لانے کے ساتھ اس میں سماج کا ایک حق تسلیم کرتا اور زندگی کو باہمی تعاون سے گزارنے کا قائل ہے جس میں

خداداد وسائل سے سب فیض یاب ہو سکیں۔ اس کا عمل اور سماجی امور میں موقف اس بات پر گواہ ہونا چاہیے کہ وہ انسانی معاشرے کو مساوات 'عفت و پاکبازی' رحمت و شفقت اور کمزور کی حمایت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس گروہ سے توقع کی جاتی ہے کہ معاشرے میں اچھائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کی روک تھام کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے گا اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے میں کبھی کوتاہی نہ کرے گا۔ ایک ایسے ہی گروہ کی عملی کوششیں انسانوں کے عملی رویے کو ان قدروں کے مطابق ڈھالنے اور ان مقاصد کا خادم بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ یہی طریق کار تحریک اسلامی کو عصر جدید کی ان سیکولر تحریکوں سے ممتاز کر سکتا ہے جو ابتدا ہی سے اپنا مرکز توجہ سماج کے تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلی کو بناتی ہیں اور انسان کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتیں۔ نیز یہی طریق اختیار کر کے ان ملکوں میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے جن کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمان نہیں ہے۔ اپنی طویل تاریخ میں مسلمان اسلام کے نام پر مختلف قوموں سے ٹکرائے بھی ہیں اور اس ٹکراؤ کی اور اس کے نتیجے میں مغلوبیت کی تلخ یادیں آج بھی ان قوموں کے ساتھ ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو نفرت اور بیزاری کے زہر سے پاک کر کے ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے حسن ظن پیدا کرنے میں 'تاکہ وہ دعوت اسلامی پر کھلے دل و دماغ سے غور کر سکیں' مذکورہ بالا طریق کار سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ لیکن یہ طریق کار اختیار کرنے کے لیے پیمبرانہ وسیع النظری اور عالی حوصلگی کی ضرورت ہے' جس سے دور حاضر کی سیاسی مزاج کی تحریکیں بالخصوص اشتراکی تحریک بالکل عاری رہی ہے' اور اس مزاج عصر کے اثرات سے اسلامی حلقے بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔

۲۔ مسلمان عوام کی ناخواندگی اور جہالت اور مسلم ممالک کی معاشی پسماندگی دور کرنے کی اسلامی اہمیت ... یہ سوال اس لیے اہمیت حاصل کر گیا ہے کہ ایک طرف تو موجودہ صورت حال خود ان تحریکوں کے پیغام کو سمجھنے اور قبول کرنے میں مانع ثابت ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر ان کی دعوت قبول کر لی جائے تو اس صورت حال کو بدلے بغیر مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام قائم ہونا دشوار ہے۔ آج کی دنیا میں بڑی طاقتوں پر انحصار کرنے والی اور ناطاقتی کا شکار محتاج قومیں تہذیبی خود ارادیت سے بھی محروم ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ان کے ان اجتماعی فیصلوں کے نفاذ میں مانع ہو گی جو بڑی طاقتوں کی پسند اور مزاج کے خلاف ہوں۔ مزید برآں عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کے زبردست استیلا اور اسلامی دنیا میں ان کے جارحانہ عزائم رکھنے والے ایجنٹوں کا وجود ایک ایسا چیلنج ہے جس کے مقابلے کے لیے فوجی طاقت بھی ناگزیر ہے۔ اس طاقت کی فراہمی کے لیے تعلیم 'بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی میں زبردست پیش رفت اور بڑے پیمانے پر صنعتی عمل (Industrialisation)

ضروری ہے۔ تحریک اسلامی کو اس سوال کا جواب دینا ہے کہ ان کاموں کی اسلامی اہمیت کیا ہے اور وہ ان کو اپنی دعوت اور نظام اصلاح و تربیت میں کیا مقام دیتی ہے؟ اس سوال کے جواب پر ان جماعتوں اور ان کے وطن کے حکمرانوں نیز سماج کے بعض دوسرے طبقات سے ان کے ربط و تعلق کی نوعیت کا بھی انحصار ہے۔ مغربی ایشیا کی تازہ ترین جنگ جس طرح شروع ہوئی جس طرح رکی اور جس طرح بڑی طاقتیں ان میں شریک رہیں' اس نے اس سوال کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ نیز اسی سے یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ اسلامی ممالک میں حکمرانوں اور اسلامی تحریکوں کا باہمی ٹکراؤ کس حد تک ضروری یا مفید ہے؟ اس امر پر بھی غور و فکر ضروری ہے کہ جس حد تک یہ ٹکراؤ عالمی سطح پر اسلام دشمن استعماری قوتوں کی ریشہ دوانیوں اور ذہنی استیلا کا نتیجہ ہے' اس حد تک اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صحیح حکمت عملی کیا ہے؟ کیا یہ زیادہ مفید نہ ہو گا کہ یہ لڑائی اپنے اصل محاذ پر لڑی جائے اور دشمن کو اس سازش میں ناکام بنایا جائے کہ یہ لڑائی ہمارے ہی گھروں کے اندر لڑی جاتی رہے۔

۳۔ اسلامی نظام کے قیام میں تدریج کا ناگزیر ہونا ماضی کے تجربات اور حال کی سنگین صورت حال نے اس بات کو زیادہ اہم بنا دیا ہے کہ تحریک کے کارکن یہ سمجھ کر آگے بڑھیں کہ ان کا مقصود رفتہ رفتہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ عرصہ تک تعلیم و تربیت اور تعمیری کاموں کی ضرورت ہے' بلکہ تجربات کے مراحل سے بھی گزرنا ہو گا اور خارجی موانع یا عارضی مسائل کے سبب بھی حصول مقصد کا عمل سست رفتار ہو سکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حکومتوں سے بہت سی قانونی تبدیلیوں کے مطالبے کو اولیت حاصل ہونی چاہیے یا کچھ اور کاموں کو' کیونکہ عصر حاضر میں اصل مسئلہ متعین اور معلوم اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہے۔ یہ کام خود ایک بڑے کام کا جزو ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عصر حاضر کی پیچیدہ زندگی میں عدل و انصاف' آزادی و مساوات' عفت و پاک بازی' سکون خاطر اور طمانیت قلب کے وہ مقاصد کس طرح حاصل کیے جائیں جن کے لیے یہ قوانین دیے گئے ہیں اور دوسرے قوانین بھی بنانے ہوں گے' مگر جو صرف قانون سے نہیں حاصل ہو سکتے بلکہ ان کے حصول کے لیے پہلے انسانوں کے خیالات و افکار' مزاج و رجحان اور حوصلوں میں تبدیلیاں درکار ہوں گی۔

۴۔ اسلامی نظام کے قیام تک' اسی مقصد کے لیے ملک کے موجودہ نظام میں اشتراک و تعاون کا مسئلہ اس مسئلے کی نوعیت مذکورہ بالا تینوں نکات کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اگر اسلامی تحریکیں دستوری اور قانونی مطالبات پر اسلامی قدروں کے عملی رواج' تعلیم و تربیت' مادی تعمیر و استحکام وغیرہ کاموں کو ترجیح دینا طے کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے ملک کی انتظامی مشینری سے کنارہ کش رہیں۔

۵۔ معاصر انسانیت اور اسلام کے درمیان اتفاق و اختلاف کے نکات کا تعین۔

۶۔معیشت و سیاست کی تنظیم اور معاشرتی زندگی میں اسلام کے دائرے میں انسانی آزادی کی وسعتیں۔

۷۔اسلام کے سیاسی نظام میں غیر مسلم کا مقام۔

۸۔اسلامی سماج میں عورت کا مقام۔

ان امور پر ہم آئندہ صفحات میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔

۹۔اسلامی زندگی کی تنظیم نو میں فقہ مرتب کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور سنت کا صحیح مفہوم۔اصولی طور پر تحریک نے اس باب میں جو موقف ابتدا میں اختیار کیا تھا وہ بدلتی ہوئی دنیا میں اللہ کی دائمی ہدایت پر عمل کے دشوار مسئلے میں صحیح راہ نمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔یہ موقف یہ تھا کہ قرآن و سنت کے منشا کے تعین میں جملہ انسانی اجتہادات و آرا قابل ترمیم ہو سکتی ہیں اور انسان صرف ان ہدایات کا پابند ہے جن کا اسے قرآن و سنت کی نصوص پابند بناتی ہوں۔نبی اکرم ؐ کی دی ہوئی ہدایات میں سے جن ہدایات کا تعلق خالصتاً دنیوی معاملات سے ہو 'مثلاً زراعت یا علاج معالجے کے طریقے وغیرہ یا اخلاقی مقاصد کے تحت دی گئی جن ہدایات کا تعلق ایسے حالات سے ہو جو اب نہیں پائے جاتے یا جن کا تعلق ان خالصتاً انتظامی اور وقتی امور سے رہا ہو جن سے آپ کو اسلامی ریاست کے صدر کی حیثیت سے عہدہ برآ ہونا تھا' ان کے فہم و تعبیر میں ان کے اس پس منظر کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔ لیکن جب عملی مسائل پر غور و بحث کا مرحلہ آتا ہے 'کسی جدید مسئلے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے 'یا مسلمان معاشروں میں رائج ایسے طریقہ کی اصلاح کا سوال پیدا ہوتا ہے جو اجتہادی احکام پر مبنی تھے مگر اب اجتماعی مفاد و مصالح کے خادم نہیں نظر آتے تو تحریک سے وابستہ اصحاب علم بسااوقات مذکورہ بالا اصولی موقف کا حق ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ان کا طرز استدلال اور ان کی آخری رائے کلیات دین پر مبنی اجتہاد کی بجائے جزئیات فقہ کی تابع نظر آتی ہے۔وہ سنت سے مقاصد و مصالح اخذ کرنے پر قانع نہیں ہوتے 'بلکہ شکلوں اور تفصیلات میں وہی طریقے قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو پہلے اختیار کیے جا چکے ہیں۔اس طرح مختلف جدید مسائل یا قابل اصلاح قدیم رواجوں کے ضمن میں ان کا موقف مزاج عصر کی رعایت سے قاصر اور عدل و انصاف 'انسانی شرف اور اجتماعی مفادات و مصالح کے اس جدید ترین فہم سے متغائر ہوتا ہے جو انسان نے اپنے حالیہ تجربات سے اخذ کیا ہے۔اس مغائرت کا مظاہرہ مختلف علاقوں میں مختلف عملی مسائل پر غور و بحث کے ضمن میں ہوا جن میں سے مثال کے طور پر چند کا ذکر کیا جا سکتا ہے: عائلی قوانین میں اصلاح' اسلام کے قانون فوجداری کی بعض دفعات' آرٹس' پردہ' تصویر' خاندانی منصوبہ بندی اور مشینی ذبیحہ۔

اب ہم اختصار کے ساتھ مذکورہ بالا چار نکات پر روشنی ڈالیں گے۔

عصر حاضر کے انسانوں کے عام ذہن و مزاج کا جائزہ لیا جائے تو جہاں بعض ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو اسلام سے اس کی دوری بڑھا رہی ہیں وہاں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنھوں نے اسے اسلام سے قریب تر کر دیا ہے۔ ان انسانوں کو دعوت اسلامی کا مخاطب بناتے وقت دونوں ہی طرح کی باتوں کو سامنے رکھنا اور ان کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مذہب اور ہدایت الٰہی سے جدید انسان کا رشتہ بہت کمزور ہو چکا ہے بلکہ اجتماعی امور حیات میں یہ رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا ہے۔ آخرت کا کوئی ایسا شعور جو ایک مثبت ضابطہ اخلاق کی بنیاد بن سکے 'مفقود ہے' خواہ یہ فقدان انکار آخرت کے سبب ہو یا شفاعت کے تصور پر مبنی ہو۔ جملہ امور زندگی کے بابت فیصلوں کے لیے عقل انسانی کے خودکفیل ہونے کا احساس اور آزادی کا غیر معتدل تصور' نہ تو عقل انسانی کی محدودیتوں کا نوٹس لیتا ہے' نہ اجتماعی مصالح کے تحت انفرادی امیدوں پر ضروری قید و بند گوارا کرتا ہے۔ اس رجحان کا سب سے بھیانک نتیجہ بڑھتی ہوئی اباحیت (Permissiveness) اور صنفی زندگی میں حیا اور عفت اور نظم و ضبط کے تمام پیمانوں کا ٹوٹ جاتا ہے۔ مادی سامان زندگی کی فراہمی' عیش کوشی اور قومی سطح پر طاقت اور دوسری قوموں پر سیاسی اور معاشی استیلا کے مقاصد اب بھی محبوب ہیں' اگرچہ بعض انسانی گروہوں میں ان کے خلاف شدید ردعمل بھی پیدا ہو چلا ہے۔

دوسری طرف زندگی کے چند ایسے اصول و مقاصد کو جن کی اسلام نے ایسے حالات میں تعلیم دی تھی جب دنیا ان سے روگرداں تھی' آج ساری انسانیت قبول کر چکی ہے۔ آزادی' مساوات' جمہوریت' سماجی عدل اور انسانی عزو شرف کے تصورات کی عملی تعبیروں میں اختلاف کے باوجود یہ بات بہت اہم ہے کہ اب دنیا ان پر متفق ہو چکی ہے۔ اسی طرح عملی خلاف ورزیوں کے باوجود امن کی مقصودیت اور جنگ کے سدباب پر سب کا اتفاق ہے۔ سو ڈیڑھ سو برس پہلے کی دنیا اس سے بہت مختلف تھی اور انسانوں کے فکر و مزاج میں یہ تبدیلی تحریک اسلامی کے لیے یقیناً خوش آیند ہے۔

اگر تحریک اسلامی مسلمانوں کو خصوصی خطاب اور ان کی اصلاح و تربیت کے اہتمام کے ساتھ سارے انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا چاہتی ہے تو اسے مذکورہ بالا دونوں باتوں کی رعایت ملحوظ رکھنی پڑے گی اور ان کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ یہ تحریکیں زیادہ تر مسلمانوں ہی میں کام کرتی رہی ہیں جس کا اثر دین کی ترجمانی اور اس کے مطالبات کے تعین دونوں پر پڑا ہے۔ اب اسے اس سوال کا جواب کہ انسان اسلام کو اپنا طریقہ زندگی کیوں بنائے' ان لوگوں کے لیے بھی دینا ہے جن کا نہ تو وہ آبائی مذہب ہے' نہ عظمت رفتہ کی یادوں کا خزانہ۔ جس کی طرف نہ مقامی روایات کا تسلسل کھینچتا ہے' نہ جس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا جذبہ' سامراجی طاقتوں کے مسلسل ظلم و استحصال کے ردعمل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے جواب اور نئے انداز دعوت کو عصبیتوں' آرزوؤں اور تاریخی یادوں

کے معیاروں سے آزاد ہو کر فطرت سلیم 'عقل عام' انسانی وجدان 'مشترک انسانی تجربات اور انسانوں کی عام مشکلات و مسائل کے حل پر مبنی ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے نقشے پر مبنی ہونا چاہیے۔ عصر حاضر میں اسلامی معاشرت 'معیشت اور سیاست کا ایسا نکھرا ہوا تصور درکار ہے جو مسلم دنیا کے رسم و رواج اور ان کی روایات سے آزاد صرف اللہ کی دائمی ہدایات پر مبنی ہو اور جس میں مختلف صالح مقامی روایات کو جذب کرنے کی صلاحیت ہو۔

چونکہ دور جدید کے عام انسان سے ہماری مراد بیشتر مغرب کا انسان یا وہ انسان ہے 'جس کے ذہن و مزاج کی تشکیل میں مغرب کے اثرات نے غالب حصہ لیا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس مخصوص رویہ کا ذکر نامناسب نہ ہو گا جو مغرب کی نسبت سے تحریک اسلامی کے حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ جس تاریخی مرحلے میں یہ تحریک ابھری اس میں فطری طور پر اس نے مسلمانوں میں اسلام پر اعتماد کے ساتھ اس کے ایک قابل فخر میراث ہونے کا طاقتور احساس پیدا کیا ہے۔ اعزاز بالاسلام کا یہ جائز جذبہ اپنے جلو میں یہ خیال بھی لایا کہ اسلام ہر اعتبار سے خود کفیل ہے اور دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں کسی اور ماخذ سے راہ نمائی حاصل نہیں کرنی ہے۔ اس جذبے کا ہدف خاص طور پر مغرب اور مغربی تہذیب تھی 'جس سے کاٹ کر اسلام کی طرف واپس لانا' تحریکوں نے اپنا اصل کام سمجھا۔ یہ جذبہ تقلید اور روایت پسندی کے اس مزاج کے ساتھ وابستہ ہو گیا جو صدیوں سے ملت نے اختیار کر رکھا ہے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ فرد کی تربیت' معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کے باب میں مغرب کا ہر طریقہ مردود ہے اور ہم اپنا طریق کار تمام تر اپنے ماضی کی روشنی میں خود مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی اس انتہائی شکل میں کہیں لکھی ہوئی نہیں ملے گی مگر اسلامی حلقوں کے عملی رویے اور ان کی تقریروں اور تحریروں میں اس کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

اس جذباتی روش کا اثر اگر صرف معاشرتی زندگی' جماعتی تنظیم کے طریقوں اور قابل اجتہاد مسائل جدیدہ پر غور و بحث پر پڑتا تو بھی اس کے نقصانات اس قابل تھے کہ اس پر کھل کر بحث کی جائے۔ مگر اس سے زیادہ اہم یہ اندیشہ ہے کہ یہ روش ' تحریک اور عام انسانوں کے درمیان غیر ضروری حجابات قائم کرنے کا سبب بن جائے گی۔

صورت حال یہ ہے کہ اسلامی مشرق میں کئی سو سال سے اجتہادی فکر' سماجی علوم کا ارتقا اور مسائل انسانی کے حل کے ضمن میں تجربات کا سلسلہ تقریباً بند رہا ہے۔ جب کہ یہ کام غیر مسلم مغرب میں پوری قوت کے ساتھ انجام پایا ہے۔ بیشتر اوقات ان علوم و تجربات کا تعلق زندگی کے ایسے امور سے ہے جن میں اسلام نے مقاصد کی نشاندہی کی ہے' ذرائع کا تعین نہیں کیا ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کچھ مذاہب عالم کے تاریخی عمل کے نتیجے میں 'کچھ اسلام ۔۔۔ براہ راست

فیضان سے اور کچھ اپنے تجربات سے سیکھ کر انسانیت متعدد بنیادی مقاصد حیات اور کلیدی اہمیت رکھنے والی قدروں پر فی الجملہ متفق ہو چکی ہے۔ مغرب کے آزاد، متحرک اور وسائل سے مالا مال معاشرے میں ان قدروں کی تحصیل کے لیے مختلف النوع تجربات ہوتے رہے۔ ہم ان تجربات سے نہ صرف یہ کہ بے نیاز نہیں رہ سکتے بلکہ قرآن و سنت کی بنیادی ہدایات کی روشنی میں ان سے پورا فائدہ اٹھا کر ہی مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں شورائیت، مساوات بنی آدم اور عدل اجتماعی کے قیام کے لیے خود ہمارا ماضی ہماری تفصیلی رہنمائی نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی کے بنیادی حالات بدل گئے ہیں۔ انسانی آبادی کی کثرت، حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذرائع کی سرعت و سہولت، علم حاصل کرنے اور پھیلانے نیز معلومات کے منظم استعمال کے طریقوں کے ارتقا اور وسائل قدرت سے استفادے میں غیر معمولی ترقی نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں اسلامی مقاصد و اقدار کی تحصیل کے لیے جہاں خود اجتہاد و اختراع ضروری ہے وہاں اب تک کے انسانی اجتہادات و اختراعات سے استفادہ بھی ناگزیر ہے۔ یہ عمل اگر شعوری طور پر اور قوت کے ساتھ انجام پانے لگے تو تحریک کو قوت کا ایک نیا منبع حاصل ہو سکے گا اور اس کے اور عام انسانوں کے درمیان ربط زیادہ پایدار بنیادوں پر قائم ہو سکے گا۔ مغرب کے خلاف ایسی عصبیت، جو خوب و ناخوب میں امتیاز نہ کرنے، مشرقی سماج کی ان تقلیدی روایات کے بقاو تسلسل کا ذریعہ بن سکتی ہے جن کو اسلام کی دائمی ہدایات کی کوئی سند حاصل نہیں ہے، اور تجربے سے مفید پائے گئے ان نئے طور طریقوں کے اختیار کرنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے جن کو اختیار کرنے کی اسلامی تعلیمات کے مطابق پوری گنجائش موجود ہے۔ تحریک اسلامی کو مسئلہ کے اس پہلو سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اسلامی سماج کو مغرب زدگی (Westernisation) سے بچانے کی کوشش جو بلاشبہ مطلوب ہے، اس انداز سے کی جائے کہ وہ اس سماج کو جدید بنانے (Modernisation) کی راہ میں رکاوٹ بن جائے کیونکہ یہ عمل سماج کی اسلامی تعمیر و ترقی کے لیے بھی ناگزیر ہے اور تاریخی قوتیں اسے روبکار لانے پر مُصر بھی ہیں۔

اب قوموں کے درمیان ربط و اختلاط اتنا بڑھ چکا ہے اور سیاسی اور اقتصادی سطح پر اشتراک و تعاون اتنا ناگزیر ہو چکا ہے کہ کسی علاقے میں بھی انسانوں کا دوسروں سے کٹ کر اپنی زندگی کو منظم کرنا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں اسلامی سماج کی تعمیر کا نقشہ بناتے وقت غیروں کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کی کیفیت پر از سرِنو غور ضروری ہے۔ یہ مسئلہ اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں یا عالمی سطح پر قائم نمایندہ اداروں کے باہمی ربط و تعلق تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم پہلو اسلامی سماج میں غیر مسلم شہریوں کے سیاسی حقوق بھی ہیں۔ حالات میں جو بنیادی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں ان کے پیش نظر اب ماضی میں اسلامی تاریخ کا کوئی ماڈل من و عن دہرایا نہیں جا سکتا بلکہ ہمیں تاریخ سے آگے

بڑھ کر خود تاریخ ساز قوت یعنی قرآن کریم کی روشنی میں اپنا طریقہ کار متعین کرنا ہوگا۔ اسلامی اصول اس بات کے متقاضی ہیں کہ مستحکم امن کے قیام اور مشترکہ انسانی مقاصد کے حصول کے لیے عالمی سطح پر مسلمان ملکوں اور غیر مسلم ممالک کے درمیان اشتراک عمل اور تعاون پایا جائے۔ اسی طرح یہ مناسب ہوگا کہ اندرون ملک بھی غیر مسلم شہریوں کو مسلمان شہریوں کے پہلو بہ پہلو برابر کے شہری حقوق حاصل ہوں اور انھیں اجتماعی مقاصد کے لیے کی جانے والی تمام کوشش میں حصہ لینے کا پورا موقع ملے۔ قرآن و سنت کے مطابق طے شدہ دستوری ڈھانچے میں بھی معیشت کی تنظیم اور عام امور مملکت کی انجام دہی میں انھیں پوری طرح شریک رکھا جاسکتا ہے۔ تحریک اسلامی کی جانب سے اس نکتے کی مزید وضاحت ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے ضروری ہے جو مسلمان ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں میں پائی جاتی ہیں اور جن کی بنیاد پر وہ اسلامی ریاست کے قیام کی مخالفت کر سکتے ہیں۔

اسلامی سماج میں عورت کے مقام بالخصوص سیاست اور معیشت میں اس کے حقوق پر اسلامی تحریکوں نے جو آرا ظاہر کی ہیں وہ مختلف پہلوؤں سے غیر اطمینان بخش ہیں۔ ایک طرف تو ان رایوں کے درمیان خاصا اختلاف ہے اور دوسری طرف اکثر رایوں پر مقامی روایات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس طرح اس بات کا اہتمام بھی پوری طرح نہیں کیا جاسکا ہے کہ قرآن و سنت کی بنیادی ہدایات کی روشنی میں جدید عورت کے حوصلوں اور توقعات کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی معتدل راہ تجویز کی جائے بلکہ اکثر اوقات ایسے فقہی جزئیات اور سابقہ نظیروں کو بھی فیصلہ کن اہمیت دے دی جاتی ہے جو ایک خاص زمانے اور کسی خاص مقام کے لیے ہی موزوں ہو سکتی ہے۔ یہ رائے ان لوگوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جو مغرب کی بے اعتدالیوں سے بیزار ہیں، اور عورت کے امتیازی وظیفہ حیات کا پورا وزن محسوس کر سکتے ہیں۔ تحریکی حلقوں کی موجودہ صورت حال دیکھ کر یہ شبہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ عورت کے ساتھ مشرق کے مسلمان معاشرے کے موجودہ طرز عمل پر راضی ہیں کیونکہ اس نے اس کو بدلنے اور عورت کو انسانی زندگی کی تعمیر کے اس عمل میں پوری طرح شریک کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی ہے، جس کا نام تحریک اسلامی ہے۔

جن امور و مسائل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تحریک اسلامی کے حلقوں میں ان کا شعور پایا جاتا ہے اور یہ احساس بھی کہ آگے بڑھنے کے لیے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ ناگزیر ہے۔ تحریک کا نیا عالمی مرحلہ اور اس کو آگے بڑھانے میں مغربی ممالک میں مقیم اعلیٰ تعلیم یافتہ ابنائے تحریک کا سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اب ان مباحث میں بھی حصہ لیا جائے اور ان کوششوں میں عملاً شریک اور دخیل بنایا جائے جو سیاست، معیشت اور معاشرت کی تنظیم نو، بین الاقوامی تعلقات کی استواری، عالمی امن کے قیام اور عالمی سطح پر اقتصادی اور سماجی عدل کے قیام کے سلسلے میں جاری ہیں۔ اس طریقے

سے یہ ممکن ہے کہ ان امور کی بابت اسلام جو ہدایات و رہنمائی دیتا ہے اسے متعلق انسانی مصالح اور عقل عام کے لیے قابل قبول استدلال کی بنیاد پر سب کے سامنے پیش کر کے انسانوں کو اسلام سے مانوس کیا جاسکے۔اسلامی تصور حیات و کائنات کے تعارف اور اسلامی عقائد کی تلقین کی جو براہ راست کوششیں کی جائیں گی ان کے لیے یہ طریقہ زمین ہموار کرنے کا سبب بنے گا کیونکہ اسلام میں انسانی مسائل کے حل، اس کے تصور حیات و کائنات اور عقائد سے براہ راست مربوط ہیں۔مثال کے طور پر خدائے واحد سے ہر فرد کا براہ راست تعلق اور اس تعلق کی بنا پر دوسرے انسانوں سے مفادات و مقاصد کے اشتراک کا احساس، نیز غیراللہ سے بے نیازی اور توحید پر مبنی آزادی فکر و ضمیر ہی سماجی عدل، مساوات اور آزادی کی متفق علیہ قدروں کی تحصیل کے لیے پایدار بنیادیں فراہم کرتی ہے۔وہ گروہ جو اپنے فکروعمل میں ان تصورات اور قدروں کے حق میں مخلص ہو کر تمام انسانوں کے ساتھ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے اشتراک عمل کرے گا عام انسانوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔جب اور جس حد تک اس عمل میں افراد اور جماعتوں کے ساتھ حکومتیں بھی شریک ہو سکیں، اسے مزید تقویت حاصل ہوگی۔اس عمل کی راہ نمائی اور اسے ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے انسانی سماجی فکر کا مسلسل ارتقا ضروری ہے۔فلسفہ، ادب اور علوم عمرانی میں اسلامی طرز فکر کی موثر نمایندگی اور ان کے اندر ان وسیع تبدیلیوں کے لیے بنیادیں فراہم کرنا جو انسانی زندگی میں اسلام کو مطلوب ہیں، عالمی سطح پر کوئی نمایاں اثر (impact) ڈالنے کے لیے شرط لازم ہے۔ہماری یونیورسٹیوں اور علمی مجالس اور دوسرے تعلیمی اداروں کو اس کام کی طرف متوجہ کیا جانا چاہیے۔یہ سوچنا چاہیے کہ ہماری دینی درس گاہیں کس طرح اس مقصد کے لیے مفید بنائی جاسکتی ہیں۔سردست ہمارے جدید تعلیمی ادارے خود شناسی سے اور قدیم درس گاہیں اس احساس سے عاری ہیں کہ انھیں دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں بھی کوئی کردار ادا کرنا ہے جس کے سبب اسلامی تحریک کو خاطر خواہ ذہنی قوت نہیں میسر آسکی ہے۔یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آیند قرار نہیں دی جاسکتی۔اگر یہ رائے درست ہے کہ سیاسی اور سماجی انقلاب کی راہ علمی اور فکری انقلاب ہی ہموار کر سکتا ہے تو ابھی راہ ہموار کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔مطبوعات کی کثرت اور نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ابھی مختلف علوم بالخصوص انسانی علوم (Human Sciences) میں مغربی اساتذہ کے لائق شاگردوں سے اونچا معیار نہیں پیش کیا جاسکا ہے۔اور تحریکی حلقوں میں مختلف کاموں کی اہمیتوں کے اعتبار سے درجہ بندی میں بھی علم و ادب اور تحقیق و تفتیش کو وہ مقام حاصل نہیں جو آیندہ کسی زبردست پیش رفت کی بنیاد بن سکے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل

تحریک اسلامی نے اپنا جو دور پورا کر لیا ہے اس نے عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ دین کی جامعیت کا شعور اور اجتماعی زندگی میں دین کی تعلیمات سے روگردانی کا ابطال' اسلام کے موزونیت اور صالحیت پر اعتماد' اس کی طرف رجوع اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا عزم آج کسی مخصوص جماعت یا حلقہ تک محدود نہیں 'بلکہ پورے مسلمان معاشرے میں عام ہو چکا ہے۔ سیاسی نظم و اتحاد اور اقتصادی صلاحیت کے اعتبار سے بھی آج اسلامی دنیا وہاں نہیں جہاں اس صدی کے آغاز میں تھی۔ ان روشن پہلوؤں کی ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اسلام کی تفہیم و ترجمانی کا کام اس حد تک انجام پا چکا ہے کہ اب بجز ضد اور ہٹ دھرمی 'تعصب اور مفاد پرستی اور جبر و تشدد کے' اسلام کے قبول عام اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں کوئی اور رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یا یہ کہ ہمارے عوام اسلام چاہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ابھی فکری اور علمی سطح پر بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دور جدید کے عام انسان کو دعوت کا مخاطب بنانے کا عمل اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ' ابھی پوری طرح شروع بھی نہیں کی جا سکی ہے اور مسلمانوں کی ۸۰ فی صد ناخواندہ اکثریت میں مذہب کے نام پر خرافات اور مذہبیت کے سہارے نیم جاہل مذہبی پیشواؤں کا وہ تسلط آج بھی قائم ہے جسے ختم کیے بغیر نہ اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے نہ معاشی پس ماندگی دور ہو سکتی ہے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور عصر حاضر میں اسلامی تعمیر نو کے تقاضوں کو پہچان کر انھیں پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بات بھی فیصلہ کن ہوگی کہ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ نے تحریک کے فرد اور لائحہ عمل میں جن نقائص اور کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے ان کو پہچاننے اور دور کرنے میں تحریک کی نئی قیادت کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہ نئی قیادت بانیان تحریک کی مقلد محض ثابت ہوتی ہے یا انھی کی طرح اجتہادی فکر سے کام لیتی ہے۔ مستقبل کی تعمیر میں اس کی نگاہیں اپنے ماضی ہی کی طرف رہتی ہیں اور وہ اس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے یا معاصر حالات کے تجزیے اور مستقبل کے بارے میں مبنی بر بصیرت اندازوں کی روشنی میں لائحہ عمل اختیار کرتی ہے۔ ایک راہ تحریک کے لیے جمود اور بالآخر موت کی راہ ہے اور دوسری راہ پر اقدام' کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

خالقِ ارض و سما کا افلاکی کلاک

پروفیسر عبدالرحمٰن عبد

انسان ہر روز بلکہ ہر لمحہ افلاک کے عظیم و جلیل اور وسیع کلاک کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے دلفریب جمال، اس کی دلکشا وسعت اور اس کی دلفزا ایکرانی کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ یہ کلاک اتنا بڑا، اس قدر فراخ، ایسا قوی اور اتنا پرہیبت ہے کہ اس کی حرکات کو اربوں انسان، خواتین اور بچے، دنیا کے ہر حصے میں دیکھتے ہیں۔ یہ کائنات کا کلاک ہے۔ اس پر سوئیاں یا ہندسے نہیں ہیں، تاہم اس کا صحیح وقت بتانے کا طریق کار (mechanism) اس قدر درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے کہ سالوں پر سال گزرے، صدیوں پر صدیاں بیتیں اور ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں قرن گزرے ہیں، مگر صحیح وقت کے معاملے میں خالق ازل کے اس کلاک میں سیکنڈ کے اربویں حصے تک کا فرق نہیں آیا۔

ہمارے معمول کے کلاک کی تین سوئیاں ہوتی ہیں جو گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ بتاتی ہیں۔ اسی طرح دیدۂ ظاہربین کے لیے آفاق کے کلاک کے بھی، سوئیوں کی جگہ تین اجزا ہیں۔ یہ تین اجزا ہماری زمین، چاند اور ہمارا سورج ہیں جو حیات و جمال اور جلال کا مرقع ہیں۔ انسان کی رہایش اور زندگی کے لیے پانی، ہوا، حرارت اور روشنی جیسی ہزاروں ضروریات والی حیات کے لیے موزوں ترین زمین، حسن ماہ کامل کا مالک ہمارا شہزادۂ جمال یعنی ضوفشاں قمر، اور قوی و عزیز تابندہ و پایندہ آفتاب عالمتاب، آتش و حرارت سے غضبناک کہ جس کی طرف ہم آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتے، اصل ابو الہول یعنی ہولناک، مرکز نور و حرارت، صاحب ہیبت و جلال، مہر درخشاں، مرکز نظام شمسی جس کے گرد آخری سیارہ پلوٹو ۷۔۵۹۷ کروڑ کلو میٹر کے حیرت فزا فاصلے پر محو طواف ہے۔

آج انسان اپنے نظام شمسی کے ان عجائبات فلکی کے بارے میں اپنے آبا سے کہیں زیادہ خبر و نظر کا مالک ہے اور اتنا ہی زیادہ متحیر ہے بلکہ حیرت سے انگشت بدنداں ہے۔ اب اسے علم ہے کہ کائنات کی بے کنار فضا میں سیارے اور ستارے اتنے دور اور بعید ہیں کہ گویا امر غیب ہیں۔ گلیلیو اور دوسرے خردمندوں نے دوربین ایجاد کر کے علم کے اصل حیرت کدے میں گویا ایک کھڑکی کھول دی۔ جدید رصد گاہیں پورے عالم میں جابجا پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنی ہوئی ہیں جن میں ایسی دوربینیں لگی ہوئی ہیں

جو کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع اجرام فلکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے بعید بین، ماہرین افلاک اس طرح آسمانوں کو چھان مارتے ہیں جس طرح بہت بلندی پر اڑتا ہوا شاہین، وسیع و عریض زمین و کوہستان پر اپنی تیز اور گہری نگاہ سے اپنے صید کی تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ انتہائی حساس اور جدید ترین دوربین کائنات کے آخری بعید کناروں سے ریڈیائی لہروں کے سگنل کو گرفت میں لے لیتی ہے۔

اب ماہرین علم الافلاک ہمیں ریڈیو اسٹرنومی کی مدد سے خالق و مالک کی ناقابل یقین وسعتوں والی اس بے حدود جنت نگاہ میں لے آئے ہیں جو ممکن ہے قدرت کے ازلی منصوبے میں حیات بعد الممات کی ابدی زندگی میں غیرفانی انسان کی جولاں گاہ بنے گی۔

رصد گاہوں میں بیٹھے ہوئے سائنس دان جدید ترین کیمروں کی مدد سے ان "غائب" سیارگان کو ہمارے دیدہ و دل کے لیے "حاضر" بنا رہے ہیں۔ سیاروں کے فاصلوں کو ناپتے ہیں ان کی کمیت، کثافت اور درجہ حرارت بتاتے ہیں۔ ان کے قطر، حجم اور رفتار کے بارے میں معلومات دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے کس کے گرد کتنے چاند ہیں اور وہ آفتاب کے گرد اپنی سالانہ سیر اور اپنے محور کے گرد چکر کتنے عرصے میں مکمل کرتے ہیں۔ علمائے افلاک ان کی کشش، جھکاؤ اور دباؤ کے بارے میں بتاتے ہیں۔ وہی کہتے ہیں کہ ہماری زمین کا مادہ یا کمیت ۶ء کے آگے ۲۰ صفریں میٹرک ٹن ہے۔ اف خدایا، ہماری زمین کتنی بڑی ہے!

لیکن نہیں، یہ تو سورج کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ سورج اتنا بڑا ہے کہ ہماری زمین جیسی سوا تین لاکھ زمینیں اس میں سما سکتی ہیں۔ عطارد ہمارے تین ماہ کے عرصے میں سورج کے گرد طواف مکمل کرتا ہے جبکہ پدی جتنا پلوٹو ہمارے ۲۴۸ سالوں کے برابر وقت میں اپنا ایک سال یعنی سورج کے گرد ایک طواف مکمل کرتا ہے۔ زہرہ وہی سیارہ ہے جو کبھی طلوع آفتاب سے پہلے مشرق کی جانب اور اکثر غروب آفتاب کے بعد مغرب کی جانب ضوفشاں نظر آتا ہے۔ فیض فطرت نے آپ کو دیدۂ شاہین عطا کیا ہے تو اسی طرح، خلوت زہرہ و زحل و زمین میں یہ اسرار ہیں فاش، جو زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ "نگاہ چاہیئے اسرار لا الٰہ کے لیے"۔

داستان آفاق کے یہ کردار اپنی دلچسپ سرگزشت بیان کرتے ہیں۔ یہ جو نظارہ ہائے گوناگوں دکھاتے ہیں، اس پر اور ان اجرام کائنات کی نزاکتوں اور عظمتوں پر دیدہ ور کا دل عجب طرح سے دھڑکتا ہے اور وہ مجسم سوال بن جاتا ہے کہ "وہ عقل کل اور دانا و بینا ہستی کون ہے جس نے ان بھاری بھرکم اور گرانڈیل اجسام کو بیکراں خلاؤں میں ان کے ازلی راستے پر ڈالا ہے اور ان کے مدار و مسیر مقرر کیے ہیں؟ وہ ذات اعلیٰ و عظیم کون ہے جس کے ادراک، دانش اور قوت و طاقت نے ایسی

زبردست تخلیقات جلیلہ کیں؟ کس نے ان کی تصویر و تشکیل اور تخلیق کا حکم دیا اور فرمان جاری کیا "کُن"۔ چنانچہ فوراً تعمیل حکم ہوئی "فیکُون"۔ اور اعظم زمین' اعلیٰ قمر' شاندار آفتاب' غیر محدود فضا' زبردست کہکشائیں اور متحیر کن کائنات وجود میں آگئے"۔

ہماری مقدس کتاب ہمیں ابدی صداقت کی راہ دکھاتی ہے اور بیان کرتی ہے "یہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے سورج کو چمکتا دمکتا بنایا ہے اور چاند کو منور و تاباں کیا ہے۔ پھر اس نے ان کے درجے اور گھٹنے بڑھنے کی منزلیں مقرر فرمائیں" (یونس ۱۰: ۵)۔ پھر یہ رہنمائی عاقل و خدا ترس کو یاد دلاتی ہے: "کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کے نظم و انتظام پر غور نہیں کیا؟ اور کیا انھوں نے اس کی مخلوقات و تخلیقات کو کھلی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کیا ہے؟" (الاعراف ۷: ۱۸۵)۔

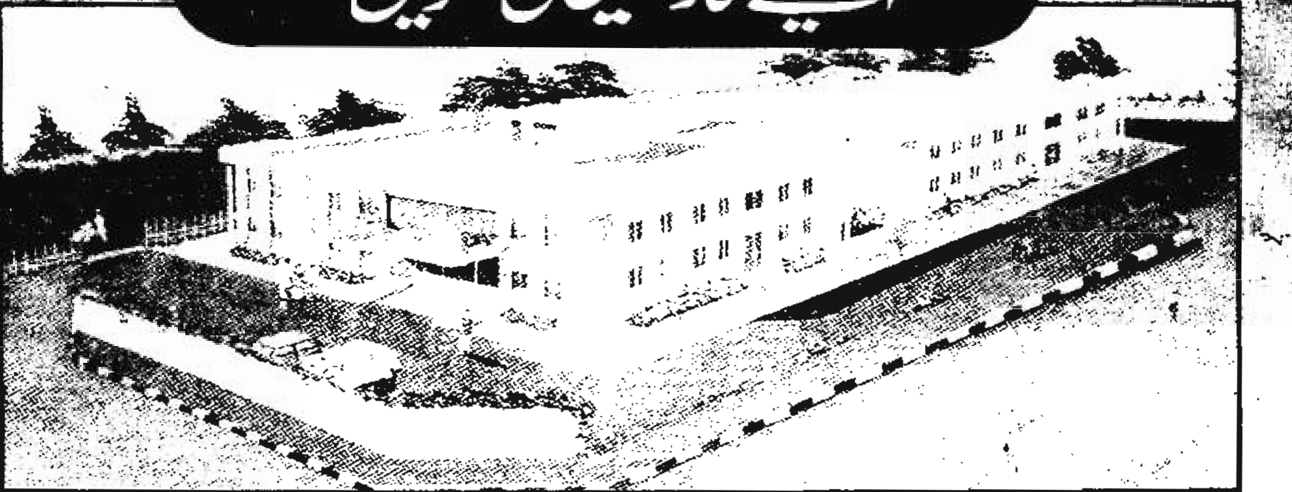
خالق ارض و سما کا افلاکی کلاک کیا ٹک ٹک کرتا ہے اور غور و فکر کرنے والے ہوشمند کو کیا پیغام دے رہا ہے؟

حکیم الامت کی ایک مشہور نظم کے تین عظیم مصرعے اس پیغام کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ اے وقت اور زمانوں کے پیدا کرنے والے! انفس و آفاق میں تیری نشانیاں ظاہر و باہر ہیں اور تیری ہی ذات لازوال اور حیّ و قیوم ہے۔

اے اَنفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پایندہ تری ذات
تو خالقِ اَعصار و نگارندۂ آفات

اور جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا سارے انسانوں کی جان بچائی (القرآن)

آیئے کارِ مسیحائی کریں



الخدمت ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) نے پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے تعاون سے کراچی کے پسماندہ علاقے ضلع غربی میں اورنگی ٹاؤن، قصبہ، علیگڑھ کالونی، بنارس اور قرب وجوار میں رہائش پذیر دکھی لوگوں کے لئے جدید سہولیات سے آراستہ ۱۰۰ بستروں کے ہسپتال کا منصوبہ تشکیل دیا ہے، اس منصوبے کے تعمیراتی اخراجات کا تخمینہ دو کروڑ روپے ہے۔

الخدمت ہسپتال

بالمقابل اورنگی ٹاؤن تھانہ، اورنگی ٹاؤن کراچی

فون: 6668893 - 6668894 فیکس: 6652883

اپنے عطیات بنام الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ نمبر 6/6 مسلم کمرشل بنک خداداد کالونی برانچ میں جمع کروائیں

الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ)

عطیہ اشتہار۔ پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کراچی۔

حالات حاضرہ

نئی صدی کس کی ہوگی؟

ترکی کے انتخابات میں رفاہ پارٹی کی کامیابی پر برطانیہ کے اخبار گارجین (۸ جنوری ۹۶) میں جان اورلے نے جو تبصرہ کیا ہے اسے ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مغرب ان نتائج کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ (مدیر)

کیا آنے والی صدی جانے والی اس صدی کے مشابہ ہوگی جس میں مغرب کی طاقت اور اقدار کی گرفت دنیا کے آخری کونوں تک پہنچ گئی تھی؟ ۱۹۹۶ میں اور اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس کا ایک اندازہ ترکی میں کرسمس کے موقع پر ہونے والے انتخابات کے نتائج سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی پارٹی رفاہ نے پارلیمنٹ میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے ملک کی دو بڑی متحارب' سیکولر پارٹیوں کو مذاکرات پر مجبور کر دیا ہے تاکہ رفاہ کو حکومت میں شرکت سے محروم کیا جا سکے۔ ان مذاکرات کا جو بھی نتیجہ ہو' یہ انتخابی نتائج ۷ سال قبل کمال اتاترک کی قائم کی ہوئی سیکولر مغرب نواز جمہوریت کے لیے ایک تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملک سیاسی عدم استحکام کے ایک دور میں داخل ہو رہا ہے جس میں اس کے مغربی سیکولر ورثہ کے مستقبل کے بارے میں کوئی یقین دہانی نہیں کی جا سکتی۔ اس میں ان سب لوگوں کے لیے بڑے پریشان کن مضمرات ہیں جو پوری دنیا میں مغربی سیکولر اقدار اور ارادوں کو رائج دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مغربی حکمت عملی کی اس بنیاد کو ہی ختم کر دیتی ہے جو اس یقین پر استوار ہے کہ مغربی تہذیب کو اختیار کرنا اور جدید ترقی یافتہ ہونا ایک ہی بات ہے۔ ترکی کی مثال ان بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کو مرکز دنیا سمجھنے کا تصور ایک فریب ہے۔ صدی کے اختتام پر ہم جس عہد میں داخل ہو رہے ہیں وہ مغربی تہذیب کے ساری دنیا میں رائج ہونے کا نہیں' بلکہ اس کے برخلاف ایک ایسا عہد ہوگا جس میں مغربی اقدار اور نمونوں کو دنیا کے بیش تر حصوں میں مسترد کیا جائے گا۔

یہ عقیدہ کہ ایک جدید ریاست کو مغربی ماڈل کا چربہ ہونا چاہیے' ان انقلابی اصلاحات کی بنیاد تھا جن سے اتاترک نے ۱۹۲۳ میں ترک جمہوریہ کا آغاز کیا۔ اس نے خلافت اسلامی کو ختم کر دیا' عربی

رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط نافذ کر دیا' دینی مدرسوں کو خلاف قانون قرار دے دیا اور ایسا لباس پہننے پر مجبور کیا جس میں چادر اور ترکی ٹوپی پہننا ممنوع تھا۔ وہ ایک فوجی ہیرو تھا۔ اس نے مغرب کا سول لا رائج کیا اور سلطنت عثمانیہ کے ملبہ سے ترکی کی جدید ریاست تخلیق کی۔ اپنے معاصر لینن کی طرح اس نے اپنے ملک کی روایات کو پسماندگی کی علامت اور یورپی طاقتوں کی اقدار کو اختیار کرنے اور ان کے اداروں کی نقالی کرنے کو ترقی قرار دیا۔

مغرب اور ترقی کے ہم معنی ہونے کے اسی نظریہ کو آج ترکی میں سنجیدہ چیلنج درپیش ہے۔ رفاہ بڑھتی ہوئی دیہی آبادی اور شہری علاقے کے غریبوں کی حمایت حاصل کرنے میں بائیں بازو کی جگہ لینے میں کامیاب رہی ہے۔ اسی حمایت کی بنیاد پر یہ مغربی سیکولر پارٹیوں کے مقابلہ پر آئی اور وزیراعظم تانسو چیلر کی اس حکمت عملی کو مشکوک بنا دیا کہ وہ ترکی میں اسلامی پارٹیوں کے عروج کی لہر کو روکنے کے لیے یورپین پارلیمنٹ سے کسٹمز یونین کے فوائد حاصل کریں۔

رفاہ کی انتخابی کامیابی سیکولر پارٹیوں کو نکال باہر کرنے یا ترک ریاست کے لیے حقیقی چیلنج بننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ترکی' ابھی مصر یا الجیریا نہیں ہے جہاں غیر مستحکم اور منتشر ریاست میں مغربی اعلیٰ طبقہ کے افراد اسلامی بغاوت کے خلاف فوجی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ کرد نسلی گروپ کی علیحدگی کی تحریکیں بھی اتنی مضبوط نہیں ہیں کہ اتاترک کی قائم کردہ ریاست کے ٹکڑے کر سکیں۔ لیکن اس کے باوجود ترکی کے اسلامی احیا کے مراحل دوسرے اسلامی ملکوں سے مماثل ہیں۔ اسلام کا طاقتور سیاسی احیا جدیدیت کے ان نظریات پر ایک تباہ کن حملہ ہے جو دوسری جنگ کے بعد سے مغربی طاقتوں کی پالیسیوں کی تشکیل کرتے رہے ہیں۔

ان نظریات کے مطابق جدیدیت' شہرکاری اور صنعتکاری کا عمل' خواندگی میں اضافہ اور نئی ٹیکنالوجیز کی مقبولیت سے ایک وقت گزرنے کے بعد بالآخر سیکولر لبرل ثقافت جنم لینا تھی' جیسا کہ مغربی یورپ میں ہوا۔ یہ ہمیشہ ایک مشتبہ دعویٰ رہا جس کی اساس تاریخ کی اصل شہادت کے بجائے اس کی مخصوص تعبیر پر تھی۔ امریکہ کی تاریخ سے اس کی تائید نہ ہوتی تھی جہاں صنعت اور ٹیکنالوجی کی جدید ترین شکلیں عیسائی بنیاد پرستی کی قدامت پسند تعبیر کے ساتھ ساتھ کامیابی سے چلیں۔ درحقیقت اس نظریہ کی بنیاد چند یورپی ممالک کے تاریخی تجربات پر تھی اور اب ملائیشیا جیسے ملکوں کی مثالوں سے بلاخوف تردید غلط ثابت ہو چکا ہے۔ جہاں معاشی ترقی بیشتر یورپی ممالک سے برتر رہی ہے اور اس لیے یا اس کے باوجود حاصل ہو سکی ہے کہ حکومت کے مغربی ماڈل مسترد کر دیے گئے تھے۔

ترکی اور ملائیشیا کی تاریخ اور حالات بہت مختلف ہیں لیکن دونوں ملکوں میں یکساں تاریخی عوامل کارفرما رہے ہیں جہاں غیر مغربی لوگ جدیدیت اور ترقی کے مغربی ماڈل کو اپنی تہذیب و روایات کے

لیے نقصان دہ قرار دے کر مسترد کر رہے ہیں۔

یہ تحریک صرف مسلمان معاشروں تک محدود نہیں ہے۔ مشرقی ایشیا کی ٹائیگر معیشتیں اپنی غیر معمولی کامیابی کا سبب مغربی انفرادیت پسندی اور معاشی آزادروی اختیار نہ کرنے کو بتاتی ہیں۔ صرف ایک نسل کے دوران سنگاپور کا تیسری دنیا کے ایک ملک سے ایسے ملک میں تبدیل ہو جانا جہاں آمدنی کی سطح اور اوسط خاندان کے لیے طبی سہولتیں برطانیہ اور نیوزی لینڈ جیسے مغربی ممالک سے بہتر ہیں' کسی مغربی ماڈل کی نقالی سے نہیں ہوا ہے۔ چین کے ارباب کار مارکسزم کے مغربی اثرات سے آزاد ہونے میں کسی مغربی ملک کے بجائے سنگاپور کو اپنے معاشروں کے لیے نمونہ قرار دیتے ہیں۔

چینی اور اسلامی دنیا میں اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ مغرب نے اپنی اقدار اور اداروں کی جو عالمی حیثیت بنائی وہ ۱۶ویں صدی کے بعد کے مختصر عرصے میں مغربی ریاستوں کے تسلط کے علاوہ کسی اور وجہ سے نہ تھی۔

مغربی ممالک پر اس عیاں ہوتی ہوئی حقیقت کے اعتراف کے اثرات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ عہد جس میں وہ ساری دنیا کے حاکم اور رہنما تھے اب ختم ہو چکا ہے۔ ہم یہ یقین ضرور رکھ سکتے ہیں کہ یہ بہت طویل ہو گا اور اس دوران بہت کچھ رد و قبول ہو گا۔ اس کو تسلیم کرنا خصوصاً امریکہ کو ہلا کر رکھ دے گا۔ جہاں کسی شک و شبہ کے بغیر یقین کیا جاتا ہے کہ سارے انسان امریکن پیدا ہوئے تھے اور پھر کسی حادثے کی وجہ سے دوسری تہذیبوں میں شامل ہو گئے۔ ۲۱ویں صدی میں غیر مغربی ممالک کی معاشی ترقیاں مغربی معاشروں کو ان کا یہ زعم ختم کرنے پر مجبور کر دیں گی کہ وہ ترقی کی شاہراہ پر آگے راستہ دکھانے والے لوگ ہیں۔

مغربی تہذیب و تمدن کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہونا ہو گا کہ ہم کسی عالمی تہذیب کے پیش رو نہیں ہیں۔ ہمیں تو مستقبل کے اس منظر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے جب غیر مغربی ممالک ہمیں اتنی ہی عزت دیں جتنی ہم نوآبادیاتی دور میں ان کو دیتے رہے۔ ترکی میں اسلامی قوتوں کی پیش قدمی کا زیادہ بنیادی سبق یہ ہے کہ آنے والی صدی میں دنیا بھر میں جو تنازعات کارفرما رہیں گے وہ مغربی نظریات کے درمیان نہیں ہوں گے۔ ان تنازعات کو جنگجو مذہبوں' نسلی احیا اور محدود قدرتی وسائل پر اضافہ آبادی کے دباؤ سے ایندھن فراہم ہو گا۔ اسی طرح کی دنیا میں ہم کو لبرل اقدار کی اشاعت کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔ لبرل اقدار کے لیے تو مسئلہ اپنی بقا کا ہو گا۔ (ترجمہ: مسلم سجاد)۔

آپ ترجمان القرآن کے قاری ہیں'
دوسروں کو بھی اس کا قاری بنایئے!

اشاعت کے لحاظ سے یہ دینی و تحریکی رسائل میں سرفہرست ہے

فالحمدللہ!

لیکن ابھی بہت سے بندگان خدا تک یہ پیغام نہیں پہنچ رہا ہے

ان تک پہنچانے میں ---- یقیناً -- آپ کوئی حصہ ضرور ادا کر سکتے ہیں

آپ کے حلقہ تعارف و اثر میں' جہاں یہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے'

پہنچانا اپنی ذمہ داری تصور کیجیے

--- پرانے پرچے ہم سے نصف قیمت پر طلب کیجیے اور نمونتہً ہدیہ کیجیے

--- سالانہ خریدار بنایئے

--- کسی مناسب فرد / اسٹال کو ایجنسی کے لیے رابطہ کرنے پر آمادہ کیجیے

اشاعت میں اضافہ کی کوشش صدقہ جاریہ ہے

اشاعت بڑھانے میں ہمارے ساتھ تعاون کیجیے

--- ہم سے رابطہ کیجیے

۲۵ سے زائد پرچوں پر ۳۳٪ کمیشن

مینیجر ترجمان القرآن ' ۵ 'اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فون : 7587916 ـ فیکس : 7832194

پولیس میں خواتین کی ملازمت

ڈاکٹر مسز شہزا کوثر چیمہ

قرآن کریم اور احادیث نبوی ؐ نے فرائض و واجبات' عبادات و معاملات اور اخروی جزاو سزا کو بیان کرتے ہوئے مرد و عورت دونوں کو مکلف ٹھہرایا ہے۔

"مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے" (النساء ۴: ۳۲)۔

مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے افعال کے ذمہ دار ہیں۔ معاشرہ میں جو جرائم کیے جاتے ہیں' وہ مردوں کی طرح عورتوں سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔ جرائم کی تحقیق و تفتیش کے لیے پولیس کا محکمہ ہے اور عموماً ملزم عورتوں سے مرد عملہ ہی تفتیش کرتا ہے۔ اس کے بے شمار مفاسد سامنے آتے رہتے ہیں۔ عدالتوں نے مختلف احکامات کے ذریعے بعض احتیاطیں لازم کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بنیادی اصلاح ہو سکتی ہے۔

عورتوں کو سزا دینے والے یا جرم کی تحقیق کرنے والے محکموں میں عورتوں کو ملازم رکھا جائے تاکہ عورتیں ہی مجرم عورتوں کو پکڑیں' ہاتھ لگائیں' تلاشی لیں اور جہاں انھیں لے جا کر جانا ہو' لے جائیں۔

اسلام کے نزدیک عورت انسانی معاشرہ کی ایک ذمہ دار اور صاحب حقوق و اختیارات فرد ہے۔ وہ سیاسی و مذہبی اور مالی معاملات انجام دے سکتی ہے' تو دوسری طرف تمدن و معاشرت کی اصلاحی تحریکات میں بھی پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لے سکتی ہے۔ خواتین اسلام نے معاشرہ میں بگاڑ کو ختم کر کے خیر و صلاح کو قائم کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ محکمہ پولیس کے ملازمین یہی فرض انجام دیتے ہیں۔ وہ قانون شکنی کرنے والوں اور شہریوں کے امن و امان میں خلل ڈالنے والوں کی سرکوبی کے لیے ہوتے ہیں' لہٰذا بوقت ضرورت خواتین اس محکمہ میں ملازمت کر سکتی ہیں۔ بعض لوگوں کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عورتیں پولیس اور فوج میں ملازمت نہیں کر سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورت کا گھر سے باہر کام کاج' ملازمت' نجی ضروریات' شادی و غمی میں شمولیت کے لیے نکلنا

""مباح"" ہے۔

""حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ حضرت سودہ ؓ پردہ کا حکم نازل ہونے کے بعد ایک رات قضائے حاجت کے لیے گھر سے نکلیں، چونکہ وہ ایک جسیم عورت تھیں، اس لیے حضرت عمر ؓ نے ان کو پہچان کر آواز دی: ""سودہ ؓ تم ہم سے کیسے چھپ سکتی ہو۔ اب ہم دیکھیں گے تم کیسے باہر نکلتی ہو""؟ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ یہ سن کر (حضرت) سودہ الٹے پاؤں واپس آگئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ہڈی آپ ؐ کے ہاتھ میں تھی کہ اتنے میں (حضرت) سودہ ؓ آئیں اور کہا حضور ؐ میں قضائے حاجت کے لیے باہر گئی تھی کہ عمر نے ایسی باتیں کیں۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں، اتنے میں آپ ؐ پر وحی نازل ہوئی، پھر وحی کی حالت دور ہوئی۔ ابھی ہڈی آپ ؐ کے دست مبارک میں تھی۔ آپ ؐ نے فرمایا: ""اجازت دے دی گئی ہے کہ ضروریات کے لیے تم گھر سے باہر نکل سکتی ہو""۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان خواتین اپنی دنیوی اور مذہبی ضروریات کے لیے گھر سے باہر جا سکتی ہیں، البتہ ان تمام باتوں کے لیے لازم ہے کہ مسلمان خواتین کی نیت صرف کام اور خدمتِ خلق ہو۔ نمود و نمائش یا گھریلو کاموں سے فرار نہ ہو۔

وطنِ عزیز پاکستان میں اگرچہ خواتین اس محکمہ سے منسلک ہیں اور ملازمت کر رہی ہیں، لیکن اس محکمہ کو خواتین کے لیے مزید فعال بنانے اور وسعت دینے کی ضرورت ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ خواتین اس محکمہ کی جانب خدمت خلق کا جذبہ لے کر بڑھیں، خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دیں اور ان معاشرتی برائیوں کو دور کرنے میں حکومت وقت کے لیے مدد و معاون ثابت ہوں، جن کے عام ہو جانے سے اسلامی فلاحی معاشرہ کا قیام مشکل ہو جاتا ہے۔

محکمہ پولیس میں عورتوں کی ملازمت کے لیے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ طالبات کی درس گاہوں میں بعض اوقات پولیس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ایسی صورت میں مرد پولیس کا ادارے میں آنا اور ذمہ داران سے رابطہ کرنا نامناسب ہے۔ طالبات کے تعلیمی اداروں میں کوئی ناگزیر ضرورت ہو تو اسے خواتین پولیس کے ہاتھوں ہی پورا ہونا چاہیے۔

مجرم عورتوں کو تفتیش کے لیے تھانہ یا عدالت میں لے جانے اور لانے کے لیے بھی لیڈی پولیس ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ایسے کام ہیں جو لیڈی پولیس بہتر انجام دے سکتی ہے۔

اس محکمہ میں خواتین کی ملازمت کے بارے میں چند سفارشات ہیں۔ اگر ان پر عمل درآمد ہو تو ""لیڈی پولیس"" فلاحی معاشرے کے قیام کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ سفارشات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- محکمہ پولیس میں ملازمت کی خواہش مند خواتین کے لیے عمر کی حد مقرر ہونی چاہیے۔ نوجوان اور غیرشادی شدہ خواتین کو اس محکمہ میں بھرتی کرنے سے گریز کیا جائے۔ خلیفہ مامون الرشید نے رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے "محکمہ جاسوس" میں سترہ سو (۱۷۰۰) عورتیں ملازم رکھی ہوئی تھیں اور وہ عورتیں "عجوزہ" یعنی بڑی عمر کی تھیں۔ (شبلی نعمانی 'المامون' طبع اول' ص ۹۳-۹۴)

۲- محکمہ پولیس میں ملازم خواتین کو اپنی حفاظت کے لیے تو ایسے داؤ سکھائے جائیں' جن سے وہ اپنا بچاؤ اور حفاظت بخوبی کر سکیں' مثلاً جوڈو کرانے کی تربیت دی جائے۔ ایسی مثالیں قرون اولیٰ کی مسلمان خواتین میں ملتی ہیں جو ہر قسم کے فنون مثلاً تیراندازی' گھڑسواری' نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں ماہر تھیں۔ ایک غیرمسلم مورخ کے الفاظ ہیں:

"یہ وہ عورتیں ہیں جو شمشیر زنی' نیزہ بازی' تیراندازی میں نہایت ماہر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نازک سے نازک موقع پر بھی یہ اپنے دامن عفت کے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوتی تھیں۔ ("خواتین اسلام کی بہادری"' سید سلیمان ندوی' ص ۲۰)

۳- پولیس میں ملازم خواتین کے لیے مردوں سے علیحدہ تربیت گاہیں ہونی چاہییں' جہاں وہ پولیس کی وردی میں ملبوس بغیر کسی جھجک کے پوری محنت و لگن سے تربیت حاصل کر سکیں۔ پولیس میں بھرتی ہونے والی خواتین کو تربیت دینے کے لیے بھی خواتین ہونی چاہییں اور انھیں پہلے اپنے ان عزیز و اقارب سے خود ٹریننگ حاصل کرنی چاہیے جو محکمہ پولیس میں ملازم ہوں۔ اس کے بعد وہ نئی خواتین کو ٹریننگ دیں۔

۴- پولیس میں ملازم عورتوں کے لیے یہ لازم قرار دیا جائے کہ پولیس کی وردی کے اوپر ایک ڈھیلا ڈھالا چوغہ (اوور آل) ہو تاکہ ان کا جسم اس چوغہ میں چھپ جائے۔

۵- لیڈی پولیس کے سر پر ٹوپی کی بجائے ایک سکارف ہونا چاہیے۔

۶- مجرم عورتوں کو تفتیش کے لیے جن تھانوں میں رکھا جائے' وہ تھانے مکمل طور پر صرف خواتین کے لیے ہوں۔ کسی مرد (سپاہی) یا تھانیدار کا اس میں عمل دخل نہ ہو۔

۷- بوجہ مجبوری اگر مردانہ پولیس کے کسی افسر کو تفتیش کے سلسلے میں خواتین کے تھانہ میں آنا پڑے تو وہ دن کے وقت آئے۔

۸- عورتوں کے تھانہ کی عمارت پوری طرح محفوظ ہو۔ دیواریں اونچی ہوں' جہاں رات کے وقت دیواروں کے اوپر لگی ہوئی خاردار تاروں میں برقی رو چھوڑ دی جائے' تاکہ خواتین چوروں غنڈوں اور شرپسند عناصر سے محفوظ رہیں اور اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔

۹- ان کے لیے علیحدہ زنانہ ہسپتال ہو۔

۱۰۔ پولیس کی ڈیوٹی کی نوعیت ہی چونکہ اس طرح کی ہے کہ دن رات کسی وقت بھی موقع (جائے واردات) پر جانا پڑتا ہے' لہٰذا لیڈی پولیس کے پاس ہر وقت گاڑیاں موجود ہونی چاہییں تاکہ انھیں کہیں آنے جانے میں دقت پیش نہ آئے۔

۱۱۔لیڈی پولیس کی گاڑیوں کی ڈرائیور بھی عورتیں ہی ہونی چاہییں ۔سعودی عرب میں طالبات کی گاڑیوں میں مرد ڈرائیور کے ساتھ ہمیشہ اس کی بیوی بیٹھی ہوتی ہے۔ہماری حکومت کو بھی اس جانب توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

۱۲۔یہ محکمہ چونکہ رشوت خوری میں بہت بدنام ہو چکا ہے' اس لیے محکمہ کے ملازمین کو خواہ مرد ہوں یا عورت' زیادہ تنخواہیں دی جائیں' جن سے بآسانی ان کی دنیاوی ضروریات پوری ہو سکیں اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی جانب ان کا دھیان ہی نہ جائے۔ اسلام میں رشوت لینے اور رشوت دینے والے' دونوں کو جہنمی ہونے کی وعید سنائی گئی ہے۔حضرت عمر فاروق ؓ جج (قاضی یا منصف) بناتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ شخص کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو تاکہ فیصلہ کرتے وقت انصاف کر سکے اور ناجائز کمائی کی جانب اس کا دھیان نہ جائے۔

۱۳۔لیڈی پولیس کو میک اپ کی اجازت نہ ہو۔

اگر مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کیا جائے تو اس محکمہ کی کارکردگی لائق تحسین و ستائش ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خواتین میں ایثار' قربانی' محنت' لگن اور توجہ کا جذبہ مردسے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔

رسائل و مسائل

خواتین کے لیے نماز جمعہ اور تراویح

ہمارے ملک کی کچھ مسجدوں میں خواتین کے لیے نماز جمعہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اور اب رمضان میں تراویح کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یہ خیال رکھا گیا ہے تمام شرعی حدود و قیود کی پاسداری ہو' مثلاً یہ کہ ان کے آنے جانے کے راستے مردوں سے الگ اور محفوظ ہوں' ان کی نماز کی جگہ پردے میں اور مردوں سے دوری پر ہو' وضو اور طہارت کا معقول انتظام ہو' ساؤنڈ سسٹم مناسب ہو' لیکن بعض ائمہ اور علما مخالفت کر رہے ہیں اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ خاتون کے گھر اور کمرے کی نماز صحن اور مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ خواتین کو مسجد میں بلانا مناسب نہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

خواتین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس پر کتاب و سنت ناطق ہیں اور امت کا اجماع ہے۔ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے' (اور ایک روایت میں مسلمہ کے لفظ کا اضافہ بھی ہے) تحصیل علم کی فرضیت پر نص صریح ہے۔ تحصیل علم گھر میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے اور استاد کے پاس جانا پڑتا ہے۔ یہ صورت عملاً ممکن نہیں ہے کہ خواتین اپنے گھروں میں رہیں اور کوئی خاتون گھر گھر جا کر انھیں تعلیم دے۔ تاہم بالفرض اس صورت کو اختیار کر لیا جائے تو اس میں ایک خاتون کا گھر سے نکل کر دوسری جگہ جانا لازم آئے گا۔ حدیث میں تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ وسلم نے حضرت سودہ ؓ سے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ نے تمھیں اجازت دی ہے کہ تم اپنی حاجت کے لیے باہر نکلو۔ جن حاجات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت ہے ان میں تحصیل علم بھی شامل ہے۔ خواتین کی تعلیم و تربیت کے جو مختلف مواقع میسر ہیں ان سے استفادہ کیا جائے گا اور انھیں ان مواقع سے استفادے کی ترغیب دی جائے گی۔ ان مواقع میں جمعہ' عیدین' وعظ اور دروس قرآن کے اجتماعات شامل ہیں۔ اسی طرح اب دینی مدارس بھی قائم کر دیے گئے ہیں جن میں بچیوں کو قرآن و حدیث' عربی زبان' اور فقہ اسلامی کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان میں تحریکی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ ان مدارس میں بچیوں کو داخل کرنا بھی جائز ہے اور ہمارے ملک کے تمام مکاتب فکر کے علما نے ایسے

مدارس قائم کیے ہوئے ہیں جن میں طالبات باقاعدہ قیام پذیر ہوتی ہیں اور ان کے تحفظ کا پورا پورا اہتمام ہے۔ اس سلسلہ میں دراصل لوگ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ جس چیز کو شریعت نے منع کیا ہے اس کے ساتھ جائز چیز کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور پھر مطلوب اور غیر مطلوب میں بھی فرق نہیں کرتے۔

شریعت نے خاتون کو محرم کے بغیر یا خواتین کی جماعت کے بغیر سفر کرنے سے روکا ہے۔ لیکن مسافت سفر سے کم مسافت میں وہ محرم کے بغیر بھی باہر نکل سکتی ہے جبکہ فتنے کا خوف نہ ہو اور ولی یا شوہر کی طرف سے اجازت ہو۔

مسجد میں نماز باجماعت میں شرکت کی اسے ترغیب تو نہیں دی گئی لیکن اجازت دی گئی ہے۔ پانچ وقت کی نماز ہو یا نماز جمعہ' عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ گھر میں نماز پڑھے اور جائز ہے کہ مسجد میں آکر نماز باجماعت ادا کرے۔ اس کے مقابلے میں مرد کے لیے گھر میں بلاعذر شرعی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ عیدین میں چونکہ مقصود اہل اسلام کی شوکت کا اظہار بھی ہوتا ہے اس لیے عیدین میں خواتین کی شرکت کی ترغیب آئی ہے۔ اس لیے جو خواتین کے لیے مسجد میں نماز کا اہتمام کرتے ہیں' ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح مسجدوں میں آکر نمازیں پڑھیں تاکہ انھیں ثواب زیادہ ملے' بلکہ مقصد نماز جمعہ' عیدین اور دیگر مواقع پر خطبات اور وعظ اور دروس سے استفادے کی ترغیب دینا ہے۔ تعلیم و تربیت کے لیے گھر سے باہر نکلنا' مسجد میں جانا' مدرسہ میں حاضر ہونا' سکول اور کالج اور یونی ورسٹی میں جانا کسی کے نزدیک بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے ملک کے علما عرصہ سے اس کی فکر کر رہے ہیں۔ انھوں نے مساجد کے ساتھ خواتین کے لیے گیلریاں وغیرہ بنوانے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے اور بعض خواتین کو اس بات کی ترغیب بھی دیتے ہیں کہ وہ مسجدوں میں آئیں اور وعظ اور درس سے استفادہ کریں۔

جن احادیث میں خواتین کی نمازوں کو گھروں میں افضل قرار دیا گیا ہے وہ تعلیم و تربیت کے لیے مسجد اور مدرسہ میں جانے سے متصادم نہیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آج تک کسی بھی دور میں تحصیل علم کے لیے خواتین کو مسجدوں اور مجالس تعلیم و تعلم اور وعظ و تبلیغ میں جانے سے نہیں روکا گیا بلکہ اس پر تعامل رہا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تو تحصیل علم ممکن ہی نہیں جیسے کہ شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔

نیز موجودہ دور میں جبکہ مغرب خواتین کو اسلام کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمارے ملک میں مغرب زدہ خواتین لادینیت کے فروغ کے لیے میدان عمل میں نکلی ہوئی ہیں' جلسے منعقد کرتی اور جلوس نکالتی ہیں' اخبارات میں بیانات دیتی ہیں اور اسلامی اقدار و روایات اور احکام شریعت کا مذاق اڑاتی ہیں ضروری ہے کہ اسلام پسند خواتین کو تحریکی کام کی تربیت دی جائے تاکہ وہ

پرامن حالات میں شرعی حدود میں رہ کر اسلام کے لیے باہر نکلنے کی تربیت حاصل کر سکیں اور مغرب زدہ خواتین کو جواب دے سکیں۔ کیونکہ مغرب زدہ خواتین کے مقابلہ میں اسلام پسند خواتین ہی کو آگے آنا چاہیے۔ مردوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ خود ان خواتین کے مقابلہ میں میدان میں نکل کر کام کریں۔ اس لیے خواتین کے لیے نماز جمعہ اور دیگر مواقع سے استفادہ کا انتظام وقت کی ضرورت کا احساس ہے اور خواتین کے دینی حقوق کے حوالے سے شریعت کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔ نماز جمعہ کی طرح تراویح کے لیے بھی خواتین کا انتظام ہونا چاہیے تاکہ جو خواتین پورا قرآن پاک سننا چاہیں وہ سن سکیں' نیز تراویح کے موقع پر قرآن پاک کے مضامین کا جو خلاصہ پیش کیا جاتا ہو یا کوئی دوسرا تعلیمی و تربیتی پروگرام ہوتا ہو تو اس سے بھی استفادہ کر سکیں۔ (مولانا عبدالمالک)

ایک لیڈی ڈاکٹر کی پریشانی

میرا کام زنانہ مریضوں کے ساتھ ہے اور میرا کلینک زچہ بچہ کلینک ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں کچھ کیس بہت اچھے ہو جاتے ہیں اور کچھ کے ساتھ ہماری پوری کوشش کے باوجود حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک مریضہ کا بچہ دوران زچگی ختم ہو گیا۔ میں نے سرتوڑ کوشش کی کہ بچے کو زندہ نکال لیا جائے لیکن میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اگر وہ مریض بھی اس کو رب کی رضا سمجھ کر قبول کر لیتے تو میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رہتا۔ لیکن انھوں نے اس چیز کو قبول نہیں کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ میری غلطی ہے۔ گو کہ مجھ سے کوئی مطالبہ یا شکوہ نہیں کیا مگر مجھے کچھ دوسرے لوگوں کی زبانی یہ کیفیت معلوم ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی اور میرے خیال میں اس عورت کی حالت اس وقت ایسی بھی نہ تھی کہ آپریشن کر لیا جاتا۔ بہرحال میں نے پورے خلوص سے کام کیا تھا۔

دوسری ایک مریضہ کا نارمل ہونا مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس کا آپریشن کیا اور آپریشن کے دوران کچھ پیچیدگی ہو گئی۔ وہ بچ تو گئی ہے' بچہ بھی بچ گیا ہے' لیکن صحت اب ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا میاں بھی سخت ناراض ہوا ہے اس بات پر کہ اس پیچیدگی اور خرچہ کی ذمہ دار میں ہوں۔ وہ درگزر پر تیار نہیں ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا دونوں مریضوں سے میں نے کیس یا آپریشن کی کوئی فیس نہیں لی حالانکہ دونوں کے ساتھ میں نے پورے خلوص سے بہت محنت کی۔ میں سوچتی ہوں کہ جب میرے پورے خلوص اور محنت کے باوجود کوئی کام نہیں ہو سکتا تو..... کیا پھر بھی میں مجرم ہوں؟ (میرے کلینک میں ماہانہ تقریباً ۲۰۰-۲۵۰ زچگیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے چھ سات آپریشن بھی کرنے پڑتے ہیں) جب مریض یا ان کے لواحقین اس طرح کے کیس میں درگزر نہیں کرتے تو میرا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں جنگل میں چلی جاؤں۔ جہاں کوئی انسان نہ ہو۔ کاش میں ڈاکٹر نہ ہوتی' ایک عام گھریلو عورت ہوتی سیدھی سادی۔ نہ اتنا علم ہوتا نہ اتنا سخت محاسبہ..... تب بھی کرتی ہوں' فیس بھی نہیں لیتی' کسی حد تک معذرت اور تلافی کی کوشش بھی کرتی ہوں لیکن مجھے کوئی تسلی دے دیں۔ میرا رب مجھے معاف کرے۔ وہ گناہ تو نہیں جس شفا اور زندگی اس کے اپنے ہاتھ میں ہے تو مجھ سے تو آسان حساب لے گا نا!

ایک بات اور ہے۔ طب کے ساتھ ساتھ میرے اوپر تحریکی ذمہ داری ہے۔ میں اپنے ڈویژن کی ناظمہ ہوں۔ مجھے کچھ وقت تحریک اور بچوں کو بھی دینا ہوتا ہے۔ لہٰذا میں دو بجے کے بعد سوائے ایمرجنسی کے مریض نہیں دیکھتی۔ ہاں کوئی بہت دور سے آئے تو دیکھ لیتی ہوں۔ اس پر بھی میرے آدھے مریض ناراض ہو کر چلے جاتے ہیں اور اگر دیکھوں تو پھر نبھا نہیں سکتی۔ سارا دن یہی کرتی رہوں۔ یہ بھی بہت ذہنی اذیت کا باعث بنتا ہے۔

آپ کو حقوق العباد کا جتنا شدید احساس ہے، اور اس معاملہ میں خدا کا جو خوف ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے آپ پر۔ یقیناً یہ معاملہ بہت نازک ہے، اور اس معاملہ میں ہر وقت ڈر کے رہنا چاہیے۔ لیکن مسئولیت کی حدود شریعت میں طے کر دی گئی ہیں۔ اگر آپ کی غلطی یا خطا سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کی دیت (یا مناسب مالی معاوضہ) اور کوئی کفارہ کافی ہے۔ جیسی قتل خطا کے لیے دیت ہے اور ۶۰ روزے، کوئی قصاص نہیں۔ قصاص نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ورثا سے معافی کے ساتھ آپ کے سر سے بوجھ کا ہٹنا مشروط نہیں۔ اگر آپ جان بوجھ کر نقصان پہنچائیں تو قصاص ہے۔ اگر معاملہ عزت کے نقصان کا ہے تو معاف کرانا ضروری ہے۔ خواہ اس کے لیے کچھ دینا دلانا پڑے۔ دوسری طرف اگر آپ کے پاس کوئی امانت ہو اور وہ آپ کے پاس سے ضائع ہو جائے، اور اس میں آپ کی غفلت کو دخل نہ ہو، تو اس کا کوئی تاوان نہیں۔

انسانوں کو زندگی باقی رکھنے اور صحت کے لیے علاج کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے طب کی تعلیم حاصل کرنا فرض ہے، اگرچہ فرض کفایہ ہے۔ جب آپ اپنی مقدور بھر پوری احتیاط سے علاج کرتی ہیں یا آپریشن کرتی ہیں، کوئی غفلت نہیں برتتیں، تو کامیابی و ناکامی نہ آپ کے ہاتھ میں ہے، نہ آپ کے بس میں ہے، نہ آپ اس کی ضمانت دے سکتی ہیں، نہ آپ اس کے لیے ذمہ دار اور مسئول ہو سکتی ہیں۔ شریعت کا بنیادی اصول ہے کہ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔ یہ مریض آپ کے پاس ایک امانت کی طرح ہے۔ آپ پوری دیانت داری، مہارت اور احتیاط سے اس امانت کو ادا کرتی ہیں گویا اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ پھر وہ ضائع ہو جاتی ہے۔ کوئی انسان چوری کر لیتا ہے، کوئی آپ کا مددگار نقصان پہنچاتا ہے، یا کوئی ارضی و سماوی آفت اسے ضائع کر دیتی ہے۔ تو نہ آپ مسئول ہیں، نہ آپ پر مواخذہ ہے، نہ آپ پر تاوان آتا ہے۔ نہ آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ لواحقین و ورثا آپ کو ضرور ہی معاف کریں۔ اس کے بعد، اگر آپ فیس نہیں لیتیں، معذرت بھی کرتی ہیں، اللہ سے استغفار بھی کرتی ہیں، اس کے خوف سے ڈرتی بھی ہیں، تو اس سے زیادہ آپ کیا کر سکتی ہیں۔ یہ سب کرنا لازمی نہیں، لیکن ایک اچھی اور خدا ترس ڈاکٹر اور انسان کی حیثیت سے یہ سب کرنا آپ کے لیے اچھا، مفید اور آپ کی روحانی صحت اور آخرت کے لیے ضروری ہے۔

اگر خطا ہو جائے، اور وہ ایک ڈاکٹر سے ہو سکتی ہے، تو آپ کچھ خدمت کر دیں، اور کچھ روزے

رکھ لیں - معافی بھی مانگ لیں - لیکن معاف کرنے والا' معاف نہ کرے' تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کوئی سپیل نکالے گا۔ معاف کرانے کی جتنی تاکید ہے' اتنی ہی تاکید مسلمان بھائی / بہن کا عذر قبول کرنے اور اس کو معاف کر دینے کی بھی ہے - یہ یک طرفہ معاملہ نہیں -

آپ ڈاکٹر نہ ہوتیں' کوئی خدا ترس عورت ڈاکٹر نہ ہوتی' تو عورتیں کیا سارا علاج ناخدا ترس ڈاکٹروں سے کراتیں - اور کون انسان ڈاکٹر ایسا ہو گا کہ اس کے بس سے باہر اسباب کی وجہ سے یا خطا کی وجہ سے کوئی علاج ناکام نہ ہو جائے - پھر تو سارا شعبہ طب ہی بند کرنا ہو گا۔

كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا کو یاد رکھیں - خدمت خلق سب سے بڑی عبادت ہے - اس کو آپ چھوڑنے کا ہرگز نہ سوچیں - پھر آپ تحریک سے متعلق ہیں' ڈویژن کی ناظمہ ہیں - میں کہتا ہوں کہ دو ہی پیشے' انبیا کے کام سے مشابہ ہیں: ایک معلم کا' دوسرا ڈاکٹر کا - بس حقوق العباد کے بارے میں اپنی حس اور اضطراب کو زندہ رکھیے' اپنا احتساب کرتی رہیے' اپنی پیشہ ورانہ مہارت بھی بڑھایئے' استغفار کو اپنا شعار بنا لیجیے - ہر علاج کے بعد اَلْحَمْدُلِلّٰہ اور استغفار فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ پر عمل کیجیے - علاج کامیاب ہو تو بھی' ناکام ہو تو بھی -

میری رائے میں آپ کو اپنے اوقات کی تحدید کا حق حاصل ہے - ہاں آپ کے علم کے لحاظ سے' ایمرجنسی ہو تو ہر وقت دیکھنا چاہیے' اور یہ آپ کرتی ہی ہیں - (خرم مراد)

عورت کی ملازمت

میری بیوی ایف - اے ہے اور جدید طرز زندگی سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہے - وہ چاہتی ہے کہ کوئی سرکاری ملازمت کرے' مگر میں اس بات کا حامی نہیں ہوں - میرا خیال ہے کہ روزمرہ کے اخراجات خدا کے فضل و کرم سے پورے ہو رہے ہیں - میں ملازمت کر رہا ہوں - ساتھ ڈاتی میڈیسن کی چھوٹی سی دکان ہے - مگر ان کا خیال ہے کہ اپنے ہاتھ سے کماؤں اور خرچ کروں - وہ اپنی بات منوانے کے لیے وقت بے وقت جھگڑتی رہتی ہیں - ہمارے خدا کے فضل سے دو بچے بھی ہیں - میرے سسرال والے بھی میرے حامی ہیں - ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے - کوئی راہنمائی فرمایئے -

عورت کا معاش کے لیے کام کرنا شرعاً ممنوع نہیں - لیکن بہرحال اس کا اصل مقام گھر ہے' اور بچوں کی تربیت ہے - اس لیے جب تک کوئی معاشی ضرورت نہ ہو کہ اس کی کمائی کے بغیر اخراجات پورے نہ ہوں' یا وہ خود کفالت کی ذمہ دار ہو' یا اس کے پاس ایسی صلاحیت نہ ہو' جس کی مخلوق خدا محتاج ہو' مثلاً ڈاکٹری یا تعلیم' اس وقت تک' میرے نزدیک' اس کا گھر سے باہر کمائی کے لیے نکلنا سخت ناپسندیدہ ہے' الا یہ کہ وہ بالکل فارغ ہو' اور گھر میں بیٹھی صرف مکھیاں مارتی ہو۔

جو عورت صرف ایف اے ہے' اس کے دو بچے بھی ہیں' گھر کا خرچ بھی بخوبی چل رہا ہے' اب

کے پاس فارغ وقت ہے تو مطالعے 'خدمت خلق 'تبلیغ دین وغیرہ میں گزارے جس کا اجر ابدی ہے۔ پھر جب شوہر ساری ضروریات پوری کر رہا ہو 'اور بطریق احسن کر رہا ہو 'اور گھر سے نکل کر کام کرنے کا مخالف ہو 'تو یہ اور بھی ناپسندیدہ ہے۔

آپ کے پاس تو ایک ہی راستہ ہے۔ صبر اور تحمل ' نرمی اور شفقت سے سمجھائیں اور اس کے فارغ اوقات میں اس کے لیے مفید اور دلچسپ مشاغل تلاش کریں۔ (خ - م)

ادب کے لیے کھڑے ہونا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی مجلس میں تشریف لاتے تو صحابہ کرام کو کھڑا ہونے سے منع فرماتے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب استاد کلاس روم میں داخل ہوتا ہے تو طلبہ بامر مجبوری کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ شرعی لحاظ سے غلط نہیں ہے؟

کسی کے لیے کھڑا ہونا ناجائز نہیں ہے۔ نبی کریم ؐ اور صحابہ کرام ؓ کے درمیان تعلق کی جو نسبت تھی ' اس کی بنا پر اگر صحابہ کے حضور ؐ کے لیے کھڑا ہونے کی سنت قائم ہو جاتی تو پھر یہ بعد میں آنے والوں کے لیے فتنہ کا سبب بنتی۔ دراصل جہاں کوئی کبر یا تفاخر یا طلب جاہ میں چاہے کہ دوسرے لوگ کھڑے ہوں ' یا جہاں لوگ خوشامد یا کسی کی کبریائی کے اظہار کے لیے کھڑے ہوں ' وہ ممنوع ہوگا۔ جہاں ادباً یا محبتاً کھڑا ہونا ہو ' وہاں اجازت ہو سکتی ہے۔ حضور ؐ حضرت فاطمہ ؓ کے لیے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اگر شاگرد مجبوراً کھڑے ہوتے ہیں ' اور استاد کبر کی وجہ سے خواہاں ہوتا ہے کہ کھڑے ہوں ' تو یہ جائز نہ ہوگا۔ امریکہ میں ' جہاں میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے ' ایسی کوئی روایت نہ تھی ' طلبہ بیٹھے رہتے تھے۔ (خ - م)

کتاب نما

عبد الماجد دریا بادی ' احوال و آثار : ڈاکٹر تحسین فراقی ' ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ ' ۲ کلب روڈ - لاہور - صفحات: ۷۵۲ - قیمت : ۲۵۰ روپے -

عبدالماجد دریا بادی (۱۸۹۲ - ۱۹۷۷) برعظیم ہند و پاکستان میں رواں صدی کے کثیر الجہات اکابر میں سے تھے - ان کی شخصیت بہت سی علوم کی جامع تھی - چنانچہ ان کی علمی کاوشوں کا دائرہ تفسیر و ترجمہ قرآن 'سیرت و سوانح' ادب و انشا' فلسفہ و نفسیات اور تاریخ و اخلاقیات سے لے کر علم الکلام' شاعری اور صحافت تک پھیلا ہوا ہے - انھوں نے مختلف علوم اور اصناف نثر کے ذخیرے میں قابل قدر اضافے کیے ہیں - زیر نظر کتاب دریا بادی کے سوانح و شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کے تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے - فاضل مصنف ڈاکٹر تحسین فراقی (استاد شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی) نے زیر نظر کتاب پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالے کے طور پر تحریر کی تھی لیکن ہماری یونی ورسٹیوں میں آج جس طرز و معیار کے مقالات لکھے ' لکھوائے جا رہے ہیں' یہ مقالہ ان سے کہیں بہتر و برتر اور معیاری ہے' بلکہ اسے ڈاکٹریٹ کے لیے معیاری نمونے کا ایک مقالہ (Dissertation) کہنا بے جا نہ ہو گا - مصنف نے ابتدا میں مولانا دریا بادی کے خاندان' اور ان کے مراحل حیات کی تفصیلات و جزئیات پر تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں سیر حاصل تحقیقی بحث کی ہے - پھر ان کی مختلف حیثیتوں (مترجم' سوانح نگار' شخصیت نگار' سفرنامہ نگار' شاعر' ڈراما نگار' اور مکتوب نگار وغیرہ) کا جائزہ لیتے ہوئے بطور نقاد اور محقق و مترجم' ان کا مقام و مرتبہ متعین کیا ہے - مقالے کا دوسرا حصہ دریا بادی بطور مفسر قرآن' بطور عالم دین' بطور صحافی' بطور فلسفہ شناس اور بطور نفسیات دان افکار ماجد کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے -

مولانا دریا بادی کی تصانیف کی تعداد ستر تک پہنچتی ہے - ان کا علمی و ادبی ذخیرہ کثیر اور وسیع الاطراف ہے اور اس لیے اس پر نقد و انتقاد آسان نہیں - ڈاکٹر فراقی قابل تحسین ہیں کہ وہ ایک مشکل کام سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب رہے ہیں - ان کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعے میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ دقت نظر بھی موجود ہے اور انھوں نے بڑی ہنرمندی سے ایک وسیع موضوع کو سمیٹ لیا

ہے ۔مجموعی طور پر وہ دریا بادی کی علمی فتوحات کے قائل اور مداح ہیں ۔ آخری باب میں ان کے اسلوب نثر پر تفصیلی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ دریا بادی اپنے اسلوب کے بانی بھی خود ہیں اور خاتم بھی خود۔ (مصنف نے اردو کے جن صاحبان اسلوب کا ذکر کیا ہے ان میں کچھ اور ناموں کا اضافہ بھی ممکن ہے)۔

یہ معلوم ہے کہ مولانا دریا بادی قادیانیوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے ۔ ڈاکٹر فراقی نے اس کا "سبب" پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دور الحاد میں دوسری تحریروں کے ساتھ محمد علی لاہوری کی تفسیر قرآن بھی دین و مذہب کی طرف ان کی مراجعت میں معاون ہوئی (ص ۶۵۶)۔تاہم وہ ان کے موقف کو "افسوس ناک" اور راست دریا بادی کی کمزوری سمجھتے ہیں ۔مصنف نے اس باب میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یہ رائے نقل کی ہے: "مولانا دریا بادی اپنی اجتہادی غلطی یا کسی غلط فہمی کی بنا پر قادیانیوں کی لاہوری جماعت کو زیادہ گمراہ نہیں سمجھتے تھے مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی تھی اور قادیانیوں کی دونوں جماعتوں کو گمراہ سمجھنے لگے تھے" (ص ۶۵۹)۔

ایک معروف علمی ادارے کی طرف سے شائع کردہ اعلیٰ پائے کی کتاب میں اشاریے کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے ۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)۔

میرا مطالعہ : مرتبہ: تابش مہدی ۔نگران: محمد جاوید اقبال ۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز' دہلی ۶۔ صفحات: ۲۷۹ ۔قیمت: ۵۲ روپے ۔

زیر تبصرہ کتاب "شائقین مطالعہ کو اہل علم اور دانش وروں کے مختلف اور متنوع مطالعاتی نظام سے روشناس" کرانے کے لیے مرتب کی گئی ہے ۔ محمد جاوید اقبال صاحب نے ۲' ۳ برس پہلے ایک سوال نامہ برعظیم ہندو پاکستان کے تقریباً دو سو اکابر علم و ادب اور اصحاب فکر و دانش کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اس کتاب کا بیش تر حصہ' اس سوال نامے کے جوابات پر مشتمل ہے ۔ البتہ کچھ بزرگوں سے جوابات بذریعہ مصاحبہ (انٹرویو) حاصل کیے گئے ہیں ۔"قند مکرر" کے تحت اسی موضوع پر مولانا مودودی' ابوالحسن علی ندوی' اسعد گیلانی' پروفیسر خورشید احمد اور مریم جمیلہ کی تحریریں "چراغ راہ" کراچی اور "سیارہ" لاہور سے اخذ کر کے شامل کر لی گئی ہیں ۔

چالیس علما' دانش وروں اور اساتذہ کی یہ تحریریں نہایت دلچسپ ہیں اور معلومات افزا دلچسپی کا بڑا سبب ان کا تنوع ہے ۔لکھنے پڑھنے والے ' عام طور پر تنہائی اور یکسوئی کے طالب رہتے ہیں مگر بعض اصحاب نے بتایا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مطالعہ سفر کے دوران میں کیا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ شور و شغب میں بھی پڑھ لکھ سکتے ہیں' بلکہ ایسے ماحول میں وہ زیادہ دل جمعی اور توجہ سے کام کرتے

ہیں ۔ قارئین کی اکثریت شبلی ' اقبال ' مودودی ' سلیمان ندوی ' ابوالکلام اور مولانا دریابادی سے متاثر ہے ۔ پسندیدہ کتابوں میں قرآن حکیم ' جاوید نامہ (اقبال) رسالہ دینیات (مودودی) لامیزیبلز (ہیوگو) سرفہرست ہیں ۔ ایک صاحب نے پتے کی بات کہی ہے : "جو حضرات علمی کام کرنا چاہیں ' انھیں ہمیشہ نوٹ بک ساتھ رکھنی چاہیے اور حوالے برابر نوٹ کرتے رہنے چاہییں" ۔ اس کے ساتھ ساتھ دانش وروں کے جوابات میں کچھ عبرت کے پہلو بھی ملتے ہیں ۔ مثلاً بعض حضرات پریشان ہیں کہ عمر کے آخری حصے میں اگر ان کی کتابیں کسی اچھے کتب خانے میں نہ پہنچیں تو ان کے بعد وہ ردی میں فروخت ہوں گی یا کیڑوں کی خوراک بنیں گی" (ص ۲۰۰) ۔

اصل عبرت انگیز بات تو مولانا وحید الدین خاں صاحب کی یہ رائے ہے کہ "دور جدید کے مسلم مصنفین میں سے کوئی مصنف مجھے پسند نہیں ۔ ان میں سے کسی کی کتاب میرے نزدیک علمی اسلوب پر نہیں" اور "مجھے کوئی ادیب یا شاعر پسند نہیں ۔ ادب اور شاعری کو میں ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال" اور ادبی مطالعے کو "ضیاع وقت" سمجھتا ہوں (ص ۲۱۱) ۔

ہمارا خیال ہے کہ مجموعی طور پر یہ کتاب قارئین کے لیے مفید و معلومات افزا اور سبق آموز ہے ۔ (ر - ہ) ۔

تحریک اسلامی ' طریق و ترجیحات (حصہ اول) : ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۔ ترجمہ : عبدالغفار عزیز ۔ ناشر : ادارہ معارف اسلامی کراچی ۔ صفحات : ۲۰۱ ۔ قیمت : درج نہیں ۔

تحریک اسلامی اپنا ابتدائی دور گزار کر دنیا کے مختلف ممالک میں اس مرحلے میں داخل ہوگئی ہے کہ اس کے مسائل غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کے لیے بھی موضوع بن گئے ہیں ۔ تحریک کی وسعت اور نئے زمانے کے چیلنجوں نے تحریک کے لیے نئے مسائل پیدا کیے ہیں ' اور ان کا حل باہمی غور و فکر اور رہنمائی چاہتا ہے ۔ جو مسائل اب تک اجتماعات کی چار دیواریوں میں محدود تھے اب کتابوں کی کھلی دنیا میں آگئے ہیں ۔ تحریک اسلامی کو درپیش مسائل کے حوالے سے خرم مراد اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتب شائع ہو چکی ہیں ۔ یوسف قرضاوی کی یہ کتاب ایک اچھا اور مفید اضافہ ہے ۔ عالم عرب کی اسلامی تحریکوں کے پس منظر میں لکھی گئی اس کتاب کے ترجمہ نے ہند و پاک کی تحریک اسلامی کے عام افراد تک سوچنے کے بہت سے نکات پہنچائے ہیں ۔

ہر منظم تحریک کے لیے ' جسے اپنے انسانی اور مالی وسائل کے مسئلے کو منصوبہ بندی سے خرچ کرنا چاہیے ' ترجیحات کا مسئلہ نہایت بنیادی مسئلہ ہے ۔ صرف کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ' کام نہیں ہے بلکہ مقصد کو سامنے رکھ کر ہدف کا تعین کرنا اور قرآن و سنت کی رہنمائی میں زمانہ جدید کے تمام مباح طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے حکمت عملی ترتیب دینا اور اس کے مطابق جدوجہد کرنا دراصل کام

ہے۔ فاضل مصنف نے فقہ جدید کی تشکیل پر زور دیا ہے اور "فقہ موازنہ اور فقہ ترجیحات کا تصور پیش کیا ہے۔ فقہ سے مراد وہ فقہ نہیں ہے جسے فقہ کے معروف اصطلاحی لفظ سے یاد کیا جاتا ہے بلکہ وہ مراد ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے یعنی لیتفقھوا فی الدین۔ حکمت دین کا لفظ غالباً ان کے تصور فقہ کو بہتر ادا کرتا ہے۔ مصنف نے تحریک اسلامی کی توسیع' تاجروں میں اور محنت کشوں میں کام خصوصاً خواتین میں کام کے بارے میں عملی مسائل اور مروجہ طریق کار کے حوالے سے فکر انگیز بحث کی ہے۔ ان کی سب باتوں سے سب کا اتفاق ضروری نہیں' لیکن ان کی باتوں پر کھلے ذہن سے غور و فکر ضرور ہونا چاہیے۔ آخر وہ لوگ بھی ہیں جو امیر المومنین کے تاحیات تقرر ہی کو اسلام کی روح اور انتخاب کی مدت کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ مصنف نے سیرت اور سنت کے فرق کو واضح کر کے بہت سے امور میں راہ نمائی دی ہے۔ اس کتاب کا حق تھا کہ اسے بہت اچھی طرح پیش کیا جاتا۔ (مسلم سجاد)۔

تحریک پاکستان میں علما کا سیاسی و علمی کردار : ڈاکٹر ایچ بی خان۔ ناشر: الحمد اکادمی ۲-جے ۱۸/۱ ناظم آباد کراچی۔ صفحات: ۴۴۸ + ۱۴۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

علماے کرام ہمارے معاشرے کا ہمیشہ سے نہایت فعال اور موثر حصہ رہے ہیں لیکن اجتماعی زندگی کے حوالے سے ان کے کردار کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی دینی' علمی اور تعلیمی خدمات کے تذکرے تو بہت لکھے گئے لیکن معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں ان کی خدمات کا کماحقہ احاطہ نہیں کیا گیا۔ اب تک اس سلسلے میں جو تصانیف سامنے آئی ہیں ان میں شیخ محمد اکرام کی "موج کوثر"' ضیاء الحسن فاروقی کی انگریزی کتاب مدرسہ دیوبند اور مطالعہ پاکستان' مولانا محمد میاں کی "علماے ہند کا شاندار ماضی" اور "علماے حق" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی انگریزی کاوش Ulema in Politics شامل ہیں۔ نیز' مولانا طفیل احمد منگلوری کی تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" وغیرہ میں بھی اس موضوع پر مواد ملتا ہے لیکن برعظیم کی سیاست ملی میں علما کے کردار کے بھرپور جائزے کی ضرورت ابھی تشنہ تکمیل تھی۔ ڈاکٹر ایچ بی خان نے اس موضوع پر تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور پی ایچ ڈی کا مبسوط مقالہ تحریر کیا جس کا ایک حصہ "برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علما کا کردار' بیسویں صدی میں" کے عنوان سے قومی ادارہ براے تحقیق تاریخ و ثقافت کے زیر اہتمام ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے ابتدائی چالیس سالہ دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۷ کے ہنگامہ خیز اور فیصلہ کن عہد سیاست پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ فاضل مصنف کی ایک اور کتاب میں برعظیم میں اسلامی سلطنت کے قیام سے تشکیل کانگریس تک (۱۲۰۶-۱۸۸۵) کے دور میں علما کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اس موضوع پر بڑے

تسلسل اور پوری توجہ سے کام کرنے کی کوشش کی ہے۔

عام طور پر ہمارے مورخین مختلف تعصبات کے زیر اثر ملت کے تمام عناصر کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے اور پھر بعض اوقات ذوق تحقیق کی کمی بھی سد راہ بن جاتی ہے لیکن ڈاکٹر ایچ بی خان نے ان کمزوریوں سے بچتے ہوئے تاریخ نگاری کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مختلف مسالک کے علما کے سیاسی موقف کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی حد تک معروضی انداز نظر سے کام لیا ہے۔ اگرچہ وہ ان علما کی اصابت رائے کے دل سے قائل ہیں جنھوں نے کھل کر تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا لیکن وہ ان علما کے بھی قدر دان ہیں جنھوں نے مسلم لیگ کے برعکس روش اختیار کی۔ کتاب کا ساتواں باب "اختتامیہ" ہے جس میں حاصل مطالعہ نکات کو وضاحت سے پیش کر دیا گیا ہے۔ کتاب میں عام طور پر بنیادی ماخذ سے کام لیا گیا ہے، تاہم کہیں کہیں ثانوی ماخذ بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۰۱ پر مغل حکمران بابر کا خط جمعیۃ العلمائے ہند کی دستاویزات کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ بنیادی ماخذ سے لیا جائے۔ علاوہ ازیں اس طرح کی تحقیقی کتاب میں کتابت کی غلطیاں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ صفحات ۲۹۶-۲۹۷ پر اردو، عربی اور انگریزی کے کئی لفظ غلط لکھے گئے ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کو صوری طور پر بھی بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)۔

شرح ادب القاضی : امام ابوبکر احمد بن عمر الخصاف۔ شارح: برہان الائمہ عمر بن عبدالعزیز ابن مازہ نجاری الصدر الشہید۔ مترجم: سعید احمد۔ ناشر: ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ صفحات: جلد اول: ۲۷۲، جلد دوم: ۲۳۶۔ قیمت: اول: ۱۰۰ روپے، دوم: ۱۵۰ روپے۔

اسلام نے ظلم اور ناانصافی سے پاک معاشرہ قائم کرنے کے لیے ایک جامع نظام عدل و قضا بھی فراہم کیا ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کا کوئی نظام اسلام کا ہم پلہ نہیں۔ قرون اولیٰ میں اسلام کے نظام قضا کی ترتیب کے سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں، وہ قانون کے شعبے میں لائق رشک اضافہ متصور ہوتی ہیں۔ امام خصاف (م ۲۶۱ ھ) کی گراں قدر تصنیف "ادب القاضی" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب قاضیوں اور ماہرین قانون کی نظر میں ہمیشہ قابل اعتماد رہی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے نظام عدل گستری سے وابستہ جملہ امور کو نہایت عمدہ پیرائے میں مرتب کر دیا ہے۔ کتاب کی بے مثال افادیت اور امتیازی حیثیت کے پیش نظر متعدد جلیل القدر فقہا نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں صدر الشہید (م ۵۳۶ ھ) کی شرح کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ چار جلدوں پر مشتمل شرح قضا ایک جامع اور مبسوط کتاب ہے اور اس میں منصب قضا کی اہمیت، عدالت کے آداب و ضوابط اور قاضی کے فرائض اور اختیارات وغیرہ جملہ امور کو حسن ترتیب سے پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب

موضوع سے متعلق آیات قرآنی' احادیث نبوی و آثار و اخبار صحابہ' آرا و افکار فقہا اور مسائل شرعی کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس کتاب کو جمہوریہ عراق کی وزارت اوقاف کے تحت بلال الرحمان نے محققانہ انداز سے مرتب کیا ہے۔ اور اسی مرتبہ نسخے کو ادارۂ تحقیقات اسلامی کے فاضل محقق جناب سعید احمد نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مترجم نے بعض غیر متعلق حصوں کا ترجمہ حذف کر دیا ہے البتہ کتابیات اور اشاریوں کو مزید بہتر اور جامع بنانے کی سعی کی ہے۔

فاضل مترجم نے ایک ایسی کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کا موضوع مشکل اور عبارت دقیق ہے۔ انھوں نے ترجمے کو آسان اور سادہ بنانے کے لیے جو محنت و کاوش کی ہے اس کا اندازہ اصل کتاب اور ترجمے کے تقابل سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا اصل مقصد قانون اور عدل سے متعلق اصحاب کو معلومات فراہم کرنا ہے لیکن ترجمہ اس قدر دلچسپ اور عام فہم ہے کہ اس سے عام لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

کتاب کو بہت عمدگی سے کمپوز اور طبع کیا گیا ہے۔ تاہم بعض غلطیاں دیکھنے میں آئی ہیں جن کی تصحیح کے لیے اغلاط نامے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود کہیں کہیں غلطی رہ گئی ہے' مثلاً جلد اول کے صفحہ ۱۳۹ پر تذکیہ کی جگہ تزکیہ ہونا چاہیے تھا۔ جلد اول کے آخر میں اصطلاحات کا جو اشاریہ دیا گیا ہے اس کے مندرجات (ص: ۲۶۸) کی ترتیب درست نہیں رہی۔ شاید کاپی جوڑتے وقت ایسا ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر دی جائے گی۔ جلد دوم میں اصطلاحات کے اشاریے کی عدم موجودگی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ چاروں جلدوں کے اشاریوں کے عنوانات یکساں ہونے چاہییں (ر - ب - ش)۔

زندگی اور زاویے : رباب عائشہ۔ ناشر: بک پروموٹرز' بلاک ۱۹ مرکز ایف سیون' اسلام آباد۔ صفحات: ۲۲۲۔ قیمت: -/۱۲۰ روپے

رباب عائشہ کی ہلکی پھلکی تحریروں کا یہ مجموعہ معاشرے کے گھمبیر مسائل کو خوب صورت انداز سے سامنے لاتا ہے۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ چلتے پھرتے وہ خواتین کے حوالے سے جن مسائل کا مشاہدہ کرتی ہیں' انھیں اس طرح بیان کرتی ہیں کہ اس کے مختلف پہلو سامنے آجائیں۔ ٹریفک کا مسئلہ' کشمیر کا بھکاریوں کا مسئلہ' بچوں کی جہالت کا مسئلہ' کل ۵۲ عنوانات ہیں۔ ہر عنوان ایک مسئلہ ہے' کچھ بچے کے عنوان کے تحت' کچھ عورت کے عنوان کے تحت' کچھ معاشرے کے عنوان کے تحت۔ ممتاز مفتی کے بقول: رباب عائشہ ایک عظیم ماں ہے' اس کے دل میں اپنے دکھی بچوں کے لیے بے پناہ ہمدردی ہے۔ (م - ض)

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

REGD. NO. L 5340 PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE